

"اردو ترجمہ کی روایت: نوآبادیاتی اخذ و قبول سے مابعد نوآبادیاتی مزاحمت تک کا سفر" (۲۰۲۶ تا ۱۸۰۰ء)

The Tradition of Urdu Translation: From Colonial Appropriation and Assimilation to Postcolonial Resistance. (1800 – 2026)

زبیر صدیقی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ایف. جی. لیاقت علی ڈگری کالج برائے طلباء، پشاور روڈ، راولپنڈی کینٹ، راولپنڈی، پاکستان

ڈاکٹر صائمہ صادق

ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو، ایف. جی. لیاقت علی ڈگری کالج برائے طلباء، پشاور روڈ، راولپنڈی کینٹ، راولپنڈی، پاکستان

Zubair Siddiqui

Assistant Professor, Department of Urdu, F.G. Liaquat Ali Degree College for Students, Peshawar Road, Rawalpindi Cantt, Rawalpindi, Pakistan

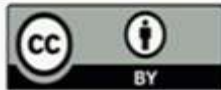
Dr. Saima Sadiq

Associate Professor, Head, Department of Urdu, F.G. Liaquat Ali Degree College for Students, Peshawar Road, Rawalpindi Cantt, Rawalpindi, Pakistan.

ISSN

eISSN: 2789-6331

pISSN: 2789-4169



Copyright: © 2026 by the authors. This is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license

Abstract:

This study traces the 226-year evolution of Urdu translation as a site of linguistic practice and cultural-political contestation. Using postcolonial and polysystem theory, it examines how translation shaped Urdu prose, ideology, and identity across key historical phases. Beginning with Fort William College (1800), where colonial patronage institutionalized Urdu prose while subordinating translators, the study moves to Sir Syed's Aligarh Movement, which reoriented translation toward scientific modernity. The Progressive Writers' Movement politicized translation through Soviet influences, whereas Halqa Arbabe-Zauq advanced a modernist, aesthetic paradigm that redefined the translator as a co-creator.

After 1947, state patronage in Pakistan and India bureaucratized translation, reducing it to clerical labor. The study also highlights enduring issues, including the "translator's treason" debate, economic marginalization, and lack of formal training. It evaluates Urdu's global

representation through selective translations of canonical and women writers, exposing Orientalist framing. In the contemporary phase (2000–2026), the study argues that AI-driven machine translation introduces a new form of data colonialism.

The research concludes that the Urdu translator has historically oscillated between clerk, ideologue, and artist, yet remains structurally constrained. It advocates a shift from literal fidelity to cultural agency, emphasizing creative re-production over mechanical transfer. The study contributes to Translation Studies by demonstrating how power, resistance, and technology shape a postcolonial literary system.

Keywords: Urdu Translation, Postcolonial Studies, Polysystem

Theory, Cultural Politics, Machine Translation, South Asian Literature-

اردو ادب کی تاریخ میں ترجمہ کبھی حاشیے پر نہیں رہا یہ ہمیشہ متن کے بیچ میں کھڑا رہا ہے۔ طلسم ہو شرابا، سے لے کر، ماں تک، قرآن کے تراجم سے لے کر عالمی منشور حقوق انسانی تک، اردو کی فکری اور تخلیقی زندگی کا ایک بڑا حصہ ترجمہ شدہ ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اردو تنقید نے ترجمے کو "اصل تخلیق" کا درجہ کبھی نہیں دیا۔ اسے ہمیشہ "دوسرے درجے کا کام" سمجھا گیا۔ مترجم کو "ادیب" نہیں، "ناقل" کہا گیا۔

یہ مقالہ اسی بنیادی مغالطے کو چیلنج کرتا ہے۔ اس کا مقدمہ یہ ہے: "ترجمہ محض لسانی منتقلی نہیں، ایک ثقافتی، سیاسی اور نظریاتی عمل ہے۔" ہر دور میں اردو والوں نے ترجمہ اس لیے نہیں کیا کہ ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا، بلکہ اس لیے کیا کہ وہ طاقت، تہذیب اور مستقبل کے تصور کو درآمد یا مزاحمت کے ذریعے بدلنا چاہتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج نے ترجمہ کیا تاکہ نوآبادکار ہندوستان کو سمجھ سکیں۔ سرسید نے ترجمہ کیا تاکہ مسلمان مغرب کو سمجھ سکیں۔

ترقی پسندوں نے ترجمہ کیا تاکہ انقلاب کو سمجھا سکیں۔ ہر ترجمہ اپنے پیچھے ایک ایجنڈا رکھتا ہے۔ یہ مقالہ اسی ایجنڈے کی تاریخ ہے۔ یہ مقالہ چار بنیادی سوالوں کے گرد گھومتا ہے:

۱۔ طاقت کا سوال: ہر دور میں ترجمے کا انتخاب کس نے کیا؟ فورٹ ولیم میں گورے نے، علی گڑھ میں سرسید نے، ترقی پسند دور میں پارٹی نے، آج این جی او، اکیڈمی، یونیورسٹی نے۔ کیا اردو مترجم کبھی آزاد تھا؟

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

۲۔ اسلوب کا سوال: کیا ہر بڑی ترجمہ تحریک نے اردو نثر کا اسلوب بدلا؟ فورٹ ولیم کی "قصہ گو نثر"، "سر سید کی "خطابیہ نثر"، ترقی پسندوں کی "کٹی ہوئی نثر" اور جدیدوں کی "علامتی نثر" اس کی مثالیں ہیں۔

۳۔ خیانت کا سوال: "مترجم غدارِ خوباں" کا فتویٰ اردو میں بہت مقبول ہے۔ مگر کیا خیانت ہمیشہ بری ہوتی ہے؟ کیا منٹو کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ اگر "مقامی گالی" ہٹا دے تو وہ خیانت ہے یا حکمت؟

۴۔ شناخت کا سوال: کیا ۲۲۶ سالہ ترجمے کے بعد اردو اب ایک "مترجم زبان" بن چکی ہے؟ کیا ہماری اپنی اصطلاحات، استعارے اور بیانیے اب ترجمہ شدہ ہیں؟

“الف: ما بعد نوآبادیاتی نظریہ”:

تجاسونی نرنجنا اور لارنس وینوٹی کے تصورات۔ "ان کے نزدیک ترجمہ نوآبادیاتی دور میں "طاقت کا ہتھیار" تھا۔ (۱) ہم دیکھیں گے کہ فورٹ ولیم اور آکسفورڈ پریس کے ترجمے کیسے تھے۔

“ب: پولی سسٹم تھیوری”:

ایون زوہر کا نظریہ کہتا ہے کہ "ہر ادب ایک نظام ہے۔ جب نظام کمزور ہوتا ہے تو ترجمہ مرکز میں آجاتا ہے۔" (۲) کیا ۱۸۵۷ کے بعد اردو نظام کمزور ہوا اور اسی لیے ترجمہ مرکز میں آیا؟

“ج: سماجیاتی تحقید”:

پیئر بور دیو کا "ثقافتی سرمایہ کا تصور" ترجمہ کس نے کیا، کیوں کیا، اور اس سے کس کو فائدہ ہوا؟ (۳)

مترجم کا مقام "ادیب" سے "ثقافتی دلال" تک کیسے بدلتا ہے؟

فورٹ ولیم کالج - استعماری ترجمہ بطور انتظامی ہتھیار (۱۸۰۰ تا ۱۸۵۴)۔ "جب ترجمہ نوآبادیاتی ضرورت بنا"

۴ مئی ۱۸۰۰ کو کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو ترجمے کی پہلی "ادارہ جاتی" پیدائش تھی۔ اس سے پہلے ترجمہ انفرادی، صوفیانہ یا درباری کام تھا۔ مگر اب پہلی بار ترجمہ "ریاستی پالیسی" بنا۔ گورنر جنرل لارڈ ویلیزلی کا مقصد واضح تھا:

"کمپنی کے نوجوان سول افسروں کو ہندوستانی زبانیں، قانون اور رسم و رواج سکھانا تاکہ وہ بہتر حکمرانی کر سکیں۔" (۴)

یہاں ترجمے کا محرک علمی نہیں، انتظامی تھا۔ انگریز افسر کو کچھری میں بیٹھ کر مقدمہ سننا تھا، لگان وصول کرنا تھا، معاہدہ لکھنا تھا۔ اس کے لیے اسے "مقامی زبان" چاہیے تھی۔ اردو، فارسی اور ہندی اس وقت رابطے کی زبانیں تھیں۔ اس لیے کالج نے "اورینٹل

سیکشن" قائم کیا اور مقامی علموں کو بھرتی کیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اردو نے پہلی بار "نوآبادیاتی نگاہ" کا سامنا کیا۔

”مترجمین: پنڈت، منشی اور صاحب کاتکون“

فورٹ ولیم کاترجمے کا نظام تین کرداروں پر کھڑا تھا:

کردار	ذمہ داری	حیثیت
منشی / پنڈت	اصل متن لکھنا یا فارسی سے اردو میں ڈھالنا	مقامی، تنخواہ دار، مگنام
انگریز صاحب	موضوع چننا، نظر ثانی کرنا، دیباچہ لکھنا	آقا، فیصلہ ساز، مصنف
متن	اخلاقی کہانیاں، قانون، قصے	سدھار " کے لیے چنا ہوا مواد

میر بہادر علی، میر امان دہلوی، شیر علی افسوس، لالو لال کوی۔ یہ سب پنڈت اور منشی تھے۔ ان کے اوپر جان گلکرسٹ، ولیم ہنٹر، اور میتھیو لیسنگٹن جیسے انگریز افسر تھے۔

"گلکرسٹ نے اردو کو "ہندوستانی" کا نام دیا اور اس کی گرامر لکھی۔" (۵)

مگر گرامر کس لیے؟ تاکہ صاحب کو فعل، فاعل سمجھ آجائے۔ یہاں "مترجم" کی حیثیت ملازم کی تھی۔ اسے تخلیقی آزادی نہیں تھی۔ اسے وہی لکھنا تھا جو صاحب چاہے میر امن کی باغ و بہار دراصل امیر خسرو کی قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ مگر میر امن نے دیباچے میں لکھا:

"صاحب کے حکم سے لکھا۔" (۶)

یہ جملہ پوری فورٹ ولیم روایت کی نفسیات بیان کر دیتا ہے۔

"متن کا انتخاب: کیا چنا گیا، کیا چھوڑا گیا"۔ فورٹ ولیم نے تقریباً ۱۰۰ کتابیں چھپوائیں۔ ان میں تین قسم کے ترجمے نمایاں ہیں:

"الف: اخلاقی قصے۔ اخلاق ہندی، مادھونل، توتا کہانی۔ یہ سنسکرت اور فارسی سے لیے گئے۔ مقصد: مقامی اخلاقیات کو سمجھنا اور اپنے افسروں کو "اچھے آقا" بنانا۔ نوآبادیاتی اقتدار کو جو ازدینے کے لیے ضروری تھا کہ رعایا کو "اخلاقی سبق" پڑھایا جائے۔

"ب: انتظامی مواد۔ قانون اسلام، آئین اکبری کے حصے۔ یہ براہ راست حکومت چلانے کے لیے تھے۔ انگریز جج کو شرعی قانون پتا ہونا چاہیے تاکہ وہ فیصلہ دے سکے۔ ترجمہ یہاں "عدالتی ہتھیار" تھا۔

"ج: زبان سازی کے نمونے۔ باغ و بہار، گنج خوبی۔ ان کا مقصد "سلیس اردو" پیدا کرنا تھا۔ فارسی زدہ دفتری زبان صاحب کو مشکل لگتی تھی۔ اس لیے ایک نئی "ہندوستانی" بنائی گئی جو فارسی سے کم بوجھل اور ہندی سے زیادہ مہذب ہو۔ یہ اردو کی پہلی "معیاری"

شکل تھی، مگر اس کا معیار لندن نے طے کیا۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

”کیا نہیں چنا گیا؟“ غزل، مرثیہ، مثنوی، تصوف، فلسفہ۔ کیونکہ ان کا انتظامی فائدہ نہیں تھا۔ فورٹ ولیم نے اردو کے ”جسم“ کا ترجمہ کیا، ”روح“ کا نہیں۔ لسانی اثرات اردو کیسے بدلی؟

فورٹ ولیم کا سب سے بڑا اثر زبان پر ہوا۔ اسے تین نکات میں سمجھا جاسکتا ہے:

”فارسی سے علیحدگی“: فورٹ ولیم سے پہلے اردو دفتری اور ادبی زبان فارسی کے زیر اثر تھی۔ کالج نے جان بوجھ کر سادہ، محاوراتی اور ہندی الفاظ والی اردو کو فروغ دیا۔ باغ و بہار کی عبارت دیکھیں: ”ایک سوداگر کا بیٹا تھا۔ وہ بہت عاقل اور دانا تھا۔“ یہ دہلی کے محاورے کی زبان ہے، لکھنؤ کی مرصع نگاری نہیں۔

”نثر کا غلبہ“: اردو میں نثر کمزور تھی، نظم طاقتور، فورٹ ولیم نے نثر کو مرکز میں لایا۔ کیونکہ نظم سے حکومت نہیں چلتی، نثر سے چلتی ہے۔ یوں اردو نثر کی باقاعدہ روایت یہاں سے شروع ہوئی۔

”چھپائی کا معیار“: اس سے پہلے کتابیں قلمی تھیں۔ کالج نے چھاپہ خانہ لگایا۔ ترجمہ چھپا، پھیلا، سند بنا۔ ”مطبوعہ“ ”متن کو“ ”مستند“ مانا گیا۔ یوں پہلی بار ”صحیح اردو“ کا تصور پیدا ہوا۔

تنقیدی جائزہ: نوآبادیاتی ترجمہ یا ثقافتی خدمت؟۔ فورٹ ولیم پر دو متضاد آراء ہیں:

”الف: نوآبادیاتی موقف“: تیجا سونی نرنجنا کہتی ہیں کہ یہ ”ترجمے کے ذریعے محکوم بنانے“ کی مثال ہے۔“ (۷)

انگریز نے مقامی زبان کو سمجھا، اسے اپنے سانچے میں ڈھالا، اور پھر اسی زبان سے حکومت کی۔ مترجم ”دلالت“ تھا جو اپنی تہذیب بیچ رہا تھا۔ اس نظریے کے مطابق ”باغ و بہار“ اردو کی فتح نہیں، شکست ہے۔

”ب: اصلاحی موقف“: اردو لسانیات کے اکثر ماہرین کا کہنا ہے کہ کالج نے اردو کو بام عروج دیا۔ اس سے پہلے اردو ”بے قاعدہ بولی“ تھی۔ کالج نے اسے گرامر دی، نثر دی، چھپائی دی۔ اگر انگریز نہ ہوتا تو اردو کبھی قومی زبان نہ بنتی۔

مقالے کا موقف: دونوں باتیں درست ہیں۔ فورٹ ولیم نے اردو کو ”طاقت“ دی مگر ”غلامی“ کی قیمت پر۔ اس نے اردو کو دفتر تک پہنچایا مگر دربار سے نکال دیا۔ اس نے نثر دی مگر غزل کو حاشیے پر دھکیل دیا۔ یہ ”ترقی اور تابعیت“ کا دوہرا عمل تھا۔ مترجم نہ مکمل غدار تھا نہ مکمل محسن۔ وہ ایک نوآبادیاتی ملازم تھا جو اپنے ہنر سے روزی بھی کما رہا تھا اور غیر ارادی طور پر اپنی زبان کو نئی زندگی بھی دے رہا تھا۔ ترجمہ انفرادی شوق سے نکل کر ادارہ جاتی منصوبہ بنا۔ ترجمے کا مقصد علم نہیں، انتظام تھا۔ متن کا انتخاب آقا نے کیا۔ ایک نئی، سلیس، نثری اردو پیدا ہوئی جو بعد میں سرسید اور حالی کے کام آئی۔ اردو مترجم کے لاشعور میں ”صاحب کی خوشنودی“ کا تصور بیٹھ گیا۔ یہ نفسیات آج تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

فورٹ ولیم بند ۱۸۵۴ میں ہوا، مگر اس کا بنایا ہوا سانچہ نہیں ٹوٹا۔ اس کے بعد آنے والی ہر ترجمہ تحریک نے اس سے یا تو بغاوت کی یا اسے دہرایا۔ سرسید نے بغاوت کی، مگر طریقہ وہی رکھا: اوپر سے فیصلہ، نیچے سے تعمیل۔

سرسید اور علی گڑھ تحریک - تہذیبی ترجمہ بطور اصلاحی اوزار (۱۸۵۷-۱۸۹۸)۔ "شکست سے خود احتسابی تک"

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی نے اردو دنیا کا تہذیبی اعتماد توڑ دیا۔ فورٹ ولیم کا "انتظامی ترجمہ" ختم ہوا اور ایک نیا سوال پیدا ہوا، مسلمان ہندوستان میں پیچھے کیوں رہ گئے؟ سرسید احمد خان کا جواب تھا: "علم سے دوری"۔ ان کے نزدیک مغرب کی ترقی کی وجہ سائنس اور عقلیت تھی۔ مشرق کی پسماندگی کی وجہ تو ہم پرستی اور قدیم نصاب تھا۔ یوں ترجمے کا مرکز کلکتہ سے علی گڑھ منتقل ہوا اور اس کا ایجنڈا بھی بدل گیا۔ فورٹ ولیم میں ترجمہ "انگریز کو ہندوستان سکھانے" کے لیے تھا۔ علی گڑھ میں ترجمہ "ہندوستانی کو مغرب سکھانے" کے لیے تھا۔ پہلاناو آبادیاتی تھا، دوسرا اصلاحی۔ مگر دونوں کا فیصلہ طاقت کے احساس کے تحت ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب "صاحب" کی جگہ "سرسید" کھڑے تھے۔

سرسید نے ترجمے کو ایک پورے نظام میں بدلا۔ تین ادارے کلیدی تھے:

ادارہ	قیام	ترجمے کا مقصد
سائنٹفک سوسائٹی غازی پور	۱۸۶۴	انگریزی سائنسی کتابوں کا اردو ترجمہ
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	۱۸۶۶	جدید مضامین اور تراجم کی اشاعت
مڈرن اینگلو اورینٹل کالج	۱۸۷۵	نصاب میں ترجمہ شدہ جدید علم شامل کرنا

طریقہ کار فورٹ ولیم سے مختلف تھا۔ وہاں انگریز موضوع چنتا تھا، یہاں سرسید خود چنتے تھے۔ وہاں مترجم گمنام مٹتی تھی، یہاں ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، شبلی نعمانی جیسے بڑے نام مترجم بنے۔ مگر ایک چیز مشترک تھی: ترجمے کا فیصلہ اوپر سے آتا تھا۔ عام قاری کی مرضی شامل نہیں تھی۔

سرسید کا اصول تھا: "پہلے سائنس، بعد میں ادب" اس لیے ہسٹری آف انڈیا از ایلینٹ، پرنسپلز آف جیالوجی، مل کی آن لبرٹی، جیسی کتابیں ترجیح بنیں۔ غالب اور میر کی غزل نہیں۔ علی گڑھ تحریک نے تین طرح کے متون چنے:

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

الف: "سائنسی تراجم"۔ مولوی ذکاء اللہ نے ریاضی، طبیعیات اور جغرافیہ کی درجنوں کتابیں ترجمہ کیں۔ تریبونومتری، فلکیات، جغرافیہ۔ مقصد تھامد ر سے کے نصاب کو جدید بنانا۔ یہ اردو میں پہلی بار "سائنسی نثر" کی پیدائش تھی۔ جملے مختصر، اصطلاحات واضح، دلیل پر زور۔

ب: "عقلی و سیاسی تراجم"۔ سر سید نے خود آئین اکبری کا دیباچہ لکھا اور "تاریخ نبیین" کا ترجمہ کروایا۔ مگر ساتھ ہی جان اسٹورٹ مل کی آن لبرٹی اور فرانسیسی انقلاب کی تاریخیں بھی منگوائیں۔ پیغام تھا کہ تقلید چھوڑو، تحقیق اپناؤ، یہ ترجمے "تہذیبی شکاک" دینے کے لیے تھے۔

ج: "اخلاقی و تہذیبی تراجم"۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس"، "توبتہ النصوص"، اصل تخلیق لگتے ہیں مگر ان کا سانچہ انگریزی اخلاقی ناول ہے۔ یہ "تہذیب کا ترجمہ" تھا۔ مغربی خاندانی نظام کی اچھی باتیں اردو گھر میں داخل کرنا مقصود تھا۔ "کیا رد کیا گیا؟" تصوف، فلسفہ اشراق، غزل کی رندانہ روایت، سر سید کے نزدیک یہ "تقلید اور تعطل" کی علامت تھی۔ یوں ترجمے نے جہاں ایک دروازہ کھولا، وہیں دوسرا بند کر دیا۔

د: "لسانی اثرات" سر سیدی نثر کی پیدائش۔ علی گڑھ نے اردو نثر کو دو سرا بڑا دھکا دیا۔ اس کی تین خصوصیات ہیں:

۱. خطاب انداز: فورٹ ولیم کی نثر قصہ گو تھی۔ سر سید کی نثر دلیل دیتی ہے، قائل کرتی ہے، ٹوکتی ہے۔ "اے مسلمانو! آنکھیں کھولو" (۸)

یہ منبر کا لہجہ ہے۔

۲. انگریزی اصطلاح کا داخلہ: کالج، کمیٹی، رول، فیل، پاس۔ یہ الفاظ پہلی بار اردو میں گھر کے لفظ بنے۔ ساتھ ہی "نیچر، قانون، سپیشیز" جیسے تصورات بھی آئے۔

۳. مقصدیت: نثر اب جمالیات کے لیے نہیں، مقصد کے لیے تھی۔ جملہ اگر خوبصورت مگر غیر واضح ہو تو سر سید کے نزدیک بے کار تھا۔ اس نے اردو کو "جدید مضمون" کے قابل بنایا۔ اس نثر پر محمد حسن عسکری نے بعد میں تنقید کی کہ "اس نے 'غزل کی روح' مار دی" (۹)

مگر حالی، شبلی اور مولوی عبدالحق اسی نثر سے پیدا ہوئے۔

تنقیدی جائزہ: اصلاح یانٹی غلامی؟۔ علی گڑھ ترجمے پر بھی دو آراء ہیں:

الف: اصلاحی موقف۔ یہ بیانیہ کہتا ہے کہ سرسید نے مسلمانوں کو جو دوسے نکالا۔ اگر سائنسی ترجمے نہ ہوتے تو اردو دنیا جدید تعلیم سے ۱۰۰ سال اور محروم رہتی۔ یہ "خود اختیاری نوآبادیات" تھی۔ ہم نے مغرب کو اپنی مرضی سے چنا۔

ب: بعد نوآبادیاتی موقف: ایڈورڈ سعید کے تناظر میں دیکھیں تو۔ "سرسید نے" مستشرق "کا کردار خود اپنالیا"۔ (۱۰)

انہوں نے مشرق کو "پسماندہ" اور مغرب کو "ترقی یافتہ" مان لیا۔ ترجمے کے ذریعے انہوں نے اسی نوآبادیاتی درجہ بندی کو اندرونی بنا دیا۔ اردو قاری کے ذہن میں بٹھا دیا کہ اصل علم انگریزی میں ہے، اردو صرف نقل کا ذریعہ ہے۔

مقالے کا موقف: سرسید کا ترجمہ "دفاعی جدیدیت" تھا۔ وہ انگریزی کی برتری کو تسلیم کر کے اس کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ اس میں کامیابی بھی ہوئی اور نقصان بھی۔ کامیابی یہ کہ اردو نثر عالمی سطح پر آئی۔ نقصان یہ کہ اردو کا جمالیاتی نظام "غیر ضروری" لگنے لگا۔ ترجمہ یہاں بھی طاقت کا ہتھیار رہا، فرق صرف اتنا تھا کہ بندوق اب اپنے ہی فرد کے ہاتھ میں تھی۔ ترجمہ "انتظام" سے نکل کر "تہذیب" تک آگیا۔ مقصد قوم کی اصلاح تھا۔ سائنس اور عقلیت پہلی بار اردو کا حصہ بنی۔ مدرسہ اور یونیورسٹی کا فاصلہ کم ہوا۔ اردو نے خطابیہ، استدلالی اور مقصدی نثر سیکھی۔ یہی نثر بعد میں ترقی پسندوں کے کام آئی۔ مغربی علم کا فارمولہ پختہ ہوا۔ مترجم کی حیثیت "مبلغ جدیدیت" کی ہو گئی۔ سرسید ۱۸۹۸ میں فوت ہوئے۔ ان کے بعد ترجمہ ایک بار پھر کروٹ بدلے گا۔ اب کی بار مرکز علی گڑھ نہیں لکھنؤ اور لاہور ہوں گے، اور ایجنڈا "اصلاح" نہیں "انقلاب" ہو گا۔

ترقی پسند تحریک۔ نظریاتی ترجمہ بطور انقلابی منشور (۱۹۳۶ تا ۱۹۶۰) "جب قلم بندوق بنا"

۱۹۳۶ میں لندن میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا منشور جاری ہوا۔ یہ فورٹ ولیم اور علی گڑھ سے بالکل مختلف لمحہ تھا۔ فورٹ ولیم میں ترجمہ "صاحب کی ضرورت" تھا۔ علی گڑھ میں "قوم کی اصلاح" تھا۔ اب ترقی پسند دور میں ترجمہ "دنیا بدلنے کا ہتھیار" بن گیا۔ پس منظر میں تین بڑے عوامل تھے:

الف: عالمی کساد بازاری: ۱۹۲۹ کے معاشی بحران نے سرمایہ داری پر سوال اٹھا دیے۔

ب: روسی انقلاب: ۱۹۱۷ کے بعد سوشلزم ایک زندہ متبادل کے طور پر سامنے آیا۔

ج: ہندوستانی سیاست: گاندھی کی تحریک، کسان بغاوتیں، مزدور ہڑتالیں۔ ادب سے مطالبہ ہوا کہ وہ "ہاتھی دانت کے مینار" سے

نکل کر میدان میں آئے۔ سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور احمد علی نے اعلان کیا: "ہم ادب کو زندگی کے قریب لائیں گے"۔ (۱۱)

اس "زندگی" کا مطلب تھا: طبقاتی کشمکش، سامراج مخالفت، جاگیر داری کا خاتمہ۔ ترجمہ اب اسی منشور کا پابند تھا۔

"ادارے اور نیٹ ورک: پارٹی، رسالہ اور پبلشر۔"

ترقی پسند ترجمہ انفرادی نہیں، تنظیمی عمل تھا۔ اس کے تین ستون تھے:

ادارہ / نیٹ ورک	کردار	اثر
انجمن ترقی پسند مصنفین	موضوع طے کرنا، نظریاتی رہنمائی	کیا چھپے گا، کیا نہیں
رسائل: نیا ادب، ادب لطیف، سویرا	تراجم شائع کرنا، بحث پیدا کرنا	قاری کی تربیت
اشاعتی ادارے: مکتبہ اردو، نیوا تاج	ستے ایڈیشن، وسیع ترسیل	مزدور اور طالب علم تک رسائی

سب سے اہم بات: ترجمے کا فیصلہ اب "صاحب" یا "سر سید" نہیں بلکہ "پارٹی لائن" کرتی تھی۔ ماسکو میں کمیونسٹ انٹرنیشنل جو ادب چاہتا تھا، وہی اردو میں آتا تھا۔ یہ فورٹ ولیم کینیڈا اور ٹرن تھا، مگر قبلہ بدل گیا تھا۔ لندن کی جگہ ماسکو آ گیا۔ متن کا انتخاب: سرخ فہرست۔ ترقی پسندوں نے ایک "سرخ فہرست" بنائی۔ اس میں وہی مصنف آسکتا تھا جو تین شرائط پر پورا اترے:

شرط اول: حقیقت نگاری۔ چیخوف، گورکی، شولوخوف، بلزاک، کیونکہ یہ سماج کا "سچ" دکھاتے تھے۔

شرط دوم: طبقاتی ہمدردی۔ مزدور، کسان، عورت ہیر و ہوں، جاگیر دار اور سرمایہ داروں ہوں۔

شرط سوم: رجائیت۔ انجام میں انقلاب کی امید ہو۔ مایوسی پھیلانے والا ادب "زوال پذیر" تھا۔

نتیجہ: گورکی کی ماں کے ۱۲ ترجمے ہوئے۔ شولوخوف کا "اور ڈان بہتارہا" مکمل ترجمہ ہوا۔ لوشن کے افسانے چھپے۔ ہیوگو کا "لے میز ریل" آیا۔

”مگر کسے نکالا گیا؟“ کا فکا، جو انس، پراؤسٹ، سارتر۔ کیونکہ یہ "بورژوا انفرادیت" اور "وجودی مایوسی" پھیلاتے تھے۔ سجاد ظہیر

نے صاف لکھا: "کانکا کا کایا کلپ ہمارے مزدور کے کس کام کا؟" (۱۲)۔ یوں ترجمہ "نظریاتی سنسر" بن گیا۔ یہ امانت نہیں، انتخاب تھا۔

اسلوبیاتی انقلاب: "روسی اردو" کی تخلیق "ترقی پسند ترجمے نے اردو نثر اور شاعری کا حلیہ بدل دیا۔

الف: "نثر میں تبدیلی" جملہ چھوٹا ہوا: "سر سید کی خطابیہ نثر اب بھی طویل تھی۔ گورکی کے مترجم علی عباس حسینی نے کاٹ دار جملے

متعارف کرائے۔ "وہ اٹھا۔ اس نے دیکھا۔ وہ چیخا" (۱۳)۔ یہ "ایکشن کی نثر" تھی۔

نئی اصطلاحات: محنت کش، رجعت پرست، رد انقلاب، طبقاتی شعور، پیداواری رشتے۔ یہ سب ترجمے سے آئیں۔ اردو اب معیشت

اور سیاست پر بات کر سکتی تھی۔ منظر نگاری، شولوخوف کے ترجموں نے "فطرت" کو رومان سے نکال کر محنت کے ساتھ جوڑا۔

"کھیت" اب صرف حسن نہیں، استحصال کی جگہ تھا۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

ب: "شاعری میں تبدیلی"۔ فیض، سردار جعفری اور مخدوم نے نظم کو ترجمے کی روح سے لکھا۔ ناظم حکمت اور پابلو نیرودا کے ترجموں نے "رزم و بزم" کو اکٹھا کیا۔ محبوب کا گیسو اب بھی تھا مگر ساتھ "ایشیا کا ہنستا ہوا چہرہ" بھی آگیا۔ ترجمے نے بتایا کہ عشق اور انقلاب ایک ہی نظم میں آسکتے ہیں۔

“مترجم کا نیا کردار:” منشی سے سپاہی تک "فورٹ ولیم کا مترجم" ملازم "تھا۔ علی گڑھ کا "مصلح" تھا۔ ترقی پسند دور کا مترجم "سپاہی" بن گیا۔ اس کے فرائض تھے:

۱۔ وفاداری متن سے نہیں، نظریے سے: اگر اصل متن میں رجعت پسند جملہ ہو تو اسے نرم کرنا یا حاشیہ میں رد کرنا جائز تھا۔ یہ "تخلیقی خیانت" کہلاتی تھی۔

۲۔ عوامی بنانا: مشکل فلسفہ کو آسان بنانا۔ مل کی آن لبرٹی کا ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحات کو مثال سے سمجھانا۔

۳۔ مقامی رنگ دینا: روسی کسان کو "جولاہا" اور زمیندار کو "چوہدری" بنانا تاکہ قاری اپنائیت محسوس کرے۔

سب سے بڑے مترجم، سبط حسن، علی عباس حسینی، قاضی عبدالغفار اور اختر حسین رائے پوری۔ ان کے دیباچے پڑھیں تو لگتا ہے منشور پڑھ رہے ہیں۔ ترقی پسند ترجمے نے اردو کو چار بڑے فائدے دیے:

۱. "عالمگیریت": "اردو پہلی بار عالمی ادبی دھارے سے جڑی۔

۲. "موضوع کا پھیلاؤ": "مزدور، کسان، عورت ادب کا مرکز بنے۔

۳. "نثر میں توانائی": "سست، مقفی نثر کی جگہ تیز، کاٹ دار نثر آئی۔

۴. "سیاسی شعور": "ادیب کو سماجی ذمہ داری کا احساس ہوا۔

مگر چار بڑے نقصان بھی ہوئے:

۱۔ "نظریاتی تنگی": "کافکا اور جوائس جیسے عظیم تجربے ۳۰ سال دیر سے آئے۔ اردو جدیدیت کا سفر رک گیا۔

۲۔ "جمالیات کی قربانی": "پیغام" کے چکر میں "ہیئت" تباہ ہوئی۔ نعرہ نظم بن گیا۔

۳۔ "مقامی روایت سے کٹاؤ": "داستان، تصوف، غزل کو "فرسودہ" کہہ کر رد کیا گیا۔ اس خلا کو بعد میں جدیدوں نے پُر کیا۔

۴۔ "نیامرکز": "لندن کی غلامی سے نکل کر ماسکو کی غلامی قبول کر لی۔ ترجمہ آزاد نہ ہو سکا۔

محمد حسن عسکری کا مشہور جملہ اسی پر تھا: "ترقی پسندوں نے انگریز کی جگہ روسی آقا بٹھادیا۔ غلامی وہی رہی، مالک بدل گیا"۔ (۱۴)

ترجمہ بطور منشور۔ پہلی بار ترجمہ "نیچے والوں" کے لیے ہوا، مگر فیصلہ پھر بھی "اوپر والوں" نے کیا۔ انتخاب: ادب کی قدر اب "جمالیت" سے نہیں "افادیت" سے ناپی گئی۔ اسلوب: اردو نثر مختصر، تیز اور اصطلاح ساز بنی۔ شاعری انقلابی ہوئی۔ مترجم: وہ "غدارِ خواباں" کے طعنے سے نکل کر "سپاہی انقلاب" بن گیا، مگر ایک نئی پارٹی لائن کا پابند ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک ۱۹۶۰ تک کمزور پڑ گئی۔ اس کی جگہ "جدیدیت" نے لے لی جس نے ترجمے کا رخ کاؤکا، کاما اور بے کیٹ کی طرف موڑ دیا۔ مگر ترقی پسندوں کا دیا ہوا سیاسی شعور اور کٹی ہوئی نثر اردو میں باقی رہی۔

"حلقہ اربابِ ذوق - جمالیاتی ترجمہ بطور فنی بغاوت (۱۹۳۹ تا ۱۹۷۰)۔" منشور کے خلاف ہیئت کی بغاوت

۱۹۳۹ میں لاہور میں "حلقہ اربابِ ذوق" کی بنیاد پڑی۔ یہ ترقی پسند تحریک کا رد عمل تھا۔ اگر ترقی پسندوں کا نعرہ تھا "ادب برائے زندگی" تو حلقے کا جواب تھا "ادب برائے ادب" پس منظر کیا تھا؟ ترقی پسندوں نے ۱۹۳۶ سے ۱۹۳۹ تک ادب کو منشور کا پابند کر دیا تھا۔ موضوع طے تھا، مزدور، کسان، انقلاب، ہیئت طے تھی، حقیقت نگاری، سادگی، پیغام۔ اس جبر کے خلاف میراجی، ان م راشد، یوسف ظفر اور قیوم نظر جیسے ادیبوں نے کہا: فن کا پہلا وعدہ جمالیت سے ہے، سیاست سے نہیں۔ یہ بغاوت صرف سیاسی نہیں، تہذیبی بھی تھی۔ ترقی پسند ماسکو کی طرف دیکھتے تھے۔ حلقے والے پیرس، لندن اور نیویارک کی طرف۔ ایک کے ہیر و گور کی تھے، دوسرے کے ایلینٹ، پاؤنڈ اور بوڈلیئر۔ یوں ترجمے کا مرکز ایک بار پھر بدلا۔ اب کی بار "نظریہ" کی جگہ "تجربہ" آیا۔ ترجمے کا نیا تصور، امانت نہیں، تخلیق نو۔ حلقے نے ترجمے کے تین روایتی اصول توڑ دیے:

روایتی اصول	حلقے کی بغاوت	نتیجہ
مترجم غدار نہیں	مترجم شریک تخلیق کار ہے	آزاد ترجمہ جائز ہوا
اصل سے وفاداری	ہیئت سے وفاداری	نظم کی جگہ نظم، نثر کی جگہ نثر
مقصد ابلاغ ہے	مقصد جمالیاتی لطف ہے	مشکل، مبہم، علامتی ترجمے قبول

میراجی کا قول مشہور ہے کہ "میں ایلینٹ کا ترجمہ نہیں کرتا، اردو میں ایلینٹ پیدا کرتا ہوں"۔ (۱۵)

اس کا مطلب تھا کہ اگر انگریزی علامت اردو قاری کو سمجھ نہ آئے تو اسے بدل دو۔ یہ "خیانت" نہیں، "ہجرت" تھی۔ متن نے زبان بدلی تو لباس بھی بدلنا چاہیے۔

متن کا انتخاب۔ ممنوعہ علاقے میں داخلہ، حلقے نے وہ سب چنا جسے ترقی پسندوں نے "بورژوازی وال" کہا کہ رد کیا تھا:

الف: علامتی شاعری۔ بوڈلیئر کی "Fleurs du Mal" مالا رے "رکے" ایلٹ کی "The Waste Land"، راشد نے دی ویسٹ لینڈ، کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کی روح سے "ایران میں اجنبی" لکھی۔

ب: شعور کی رو کے ناول۔ جیمز جوائس کا "Ulysses"، ورجینیا وولف کی "Mrs. Dalloway"، فاکنر کا "The Sound and the Fury"۔ یوسف ظفر اور انتظار حسین نے ان کے اقتباسات ترجمہ کیے۔ مکمل ترجمہ ناممکن تھا، مگر ہیئت متعارف ہو گئی۔

ج: وجودی و تجریدی فلسفہ۔ کافکا کے افسانے، کامو کا "اجنبی"، سارتر کے ڈرامے۔ محمد حسن عسکری نے کافکا کو اردو میں پہلی بار سنجیدگی سے پیش کیا۔

د: جنسیت اور جسم کا ادب۔ ڈی ایچ لارنس، ہنری ملر کے منتخب حصے۔ یہ ترقی پسند اخلاقیات کے بھی خلاف تھا۔ حلقے نے کہا: فن کا کوئی موضوع حرام نہیں۔ یہ انتخاب "خطرناک" تھا۔ کیونکہ یہ نہ سامراج کی زبان تھی نہ انقلاب کی۔ یہ فرد کی تنہائی، بے معنویت اور خواب کی زبان تھی۔

ه۔ اسلوبیاتی انقلاب: اردو کی "نئی نثر اور نئی نظم" حلقے کے ترجموں نے اردو کو تین بڑے تحفے دیے:

الف: آزاد نظم کا جواز۔ راشد نے ایلٹ سے سیکھا کہ نظم قافیہ ردیف کی پابند نہیں۔ نظم کی وحدت "داخلی صوت" سے بنتی ہے۔ یوں ماورا جیسی نظمیں ممکن ہوئیں۔ یہ فورٹ ولیم کی قصہ گو نثر اور سرسید کی خطابیہ نثر کے بعد تیسری بڑی بغاوت تھی۔

ب: علامت اور استعارے کا نظام۔ میراجی نے ہندو دیومالا، بادل، جنگل، رات کو نئے معنی دیے۔ یہ علامتیں ترقی پسندوں کی "تھوڑا اور درانتی" سے مختلف تھیں۔ اردو شاعری دوبارہ "چند معنی" والی ہو گئی۔ ایک لفظ کے سات دروازے کھل گئے۔

ج: نثری نظم اور تانیثی اسلوب۔ انتظار حسین نے فاکنر سے "طویل جملہ" اور وولف سے "یاد کی پرتیں" سیکھیں۔ یوں اردو افسانے میں وقت کا خطی تصور ٹوٹا۔ ماضی، حال، مستقبل ایک ساتھ آنے لگے۔

د: تنقیدی زبان۔ محمد حسن عسکری نے مغربی تنقید کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ اسے اردو مزاج میں ڈھالا۔ "مغربی گمراہیوں کی تاریخ" جیسی کتاب ترجمہ اور تخلیق کا سنگم ہے۔ اس نے اردو کو "اصطلاح" دی: ہیئت، تجرید، علامت، اسلوب۔

ه: مترجم کا نیاروپ، منشی سے مصورتک۔ حلقے نے مترجم کو "ناقل" سے نکال کر "تخلیق کار" بنایا۔ اس کی علامتیں:

۱. دستخط: میراجی اپنے ترجموں پر "م۔ر" لکھتے، ساتھ اصل مصنف کا نام چھوٹا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ آدھا میرا ہے۔

۲. دیباچہ نہیں، نظم: ن م راشد ترجمے سے پہلے خود ایک نظم لکھتے۔ تاکہ قاری فضا میں داخل ہو۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

۳. ناقابل ترجمہ کا اقرار: جہاں لفظ نہ ملے وہاں خالی جگہ چھوڑ دینا یا نیا لفظ گھڑنا۔ "Wasteland" کو "اجاڑ خطہ" نہیں، "ویران" کہنا۔

یہ سب ترقی پسند "سپاہی" کے بالکل الٹ تھا۔ وہاں وردی تھی، یہاں بے ترتیبی، تنقید اور تضاد آزادی کی قیمت۔ حلقے کے ترجمے نے اردو کو یہ فائدے دیے۔ ہیستی آزادی: اردو نظم ۱۰۰۰ سالہ قافیے سے نکلی۔ عالمی ہم عصری: اردو پہلی بار یورپ کے ساتھ ایک ہی وقت میں سوچنے لگی۔

فرد کی واپسی: اجتماعیت کے شور میں دبی ہوئی "میں" واپس آئی۔

تنقیدی بلوغت: عسکری نے بتایا کہ مغرب کی نقالی اور مخالفت دونوں بیماریاں ہیں۔ مگر چار نقصان بھی ہوئے۔

عوام سے دوری: علامتی نظم مشاعرے سے نکل گئی۔ کالج کے سیمینار تک محدود ہو گئی۔

بے سمتی کا الزام: ترقی پسندوں نے کہا یہ "فرار" ہے۔ ادب کو غریب کی بھوک سے کیا غرض؟

مشکل پسندی: عام قاری کے لیے اردو اجنبی ہو گئی۔

نئی اشرافیہ: پارٹی کی جگہ "ذوق" کی اشرافیہ آگئی۔ اب فیصلہ حلقے کی نشست میں ہوتا تھا۔

ترجمہ بطور تجربہ گاہ: ترجمہ "پیغام" سے نکل کر "ہیست" کی طرف آیا۔ انتخاب، ممنوعہ، مبہم اور مشکل متن اردو کا حصہ

بنا۔ اسلوب، آزاد نظم، علامت، شعور کی رو۔ اردو نے ۲۰ ویں صدی کی زبان پالی۔

مترجم، وہ سپاہی نہیں رہا، مصور بن گیا۔ مگر اس کا کینوس محدود ہو گیا۔ حلقے نے ترقی پسند جبر توڑا مگر خود ایک نئی صف بندی بنا

دی۔ ۱۹۶۰ کے بعد ترجمہ "ریاستی اداروں" کے پاس چلا گیا: مقتدرہ، اکادمی ادبیات، نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ وہاں پھر "پالیسی" آگئی۔

ساہتیہ اکیڈمی اور قومی کونسل، ادارہ جاتی ترجمہ بطور قومی منصوبہ (۱۹۵۴ تا ۲۰۰۰) "تقسیم کے بعد نئی ریاست، نئی

زبان، نیا منصوبہ" ۱۹۴۷ کی تقسیم نے اردو ترجمے کا جغرافیہ اور نفسیات دونوں بدل دیں۔ ایک طرف ہندوستان میں اردو

"اقلیت کی زبان" بن گئی۔ دوسری طرف پاکستان میں "رابطے کی زبان" مگر "سرکاری سرپرستی" سے محروم۔ دونوں ملکوں میں

ریاست نے فیصلہ کیا کہ ترجمہ اب انفرادی شوق یا نظریاتی گروہ کا کام نہیں رہے گا۔ یہ "قومی تعمیر" کا حصہ ہو گا۔ یوں فورٹ ولیم کا

"نوآبادیاتی ادارہ"، علی گڑھ کا "اصلاحی ادارہ" اور ترقی پسندوں کا "انقلابی نیٹ ورک" ختم ہوئے۔ ان کی جگہ "ریاستی ادارے"

آئے۔ ہندوستان میں ۱۹۵۴ میں ساہتیہ اکیڈمی، پاکستان میں ۱۹۵۸ میں مقتدرہ قومی زبان اور بعد میں ۱۹۶۲ میں اردو سائنس

بورڈ، ۱۹۷۹ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ ترجمہ اب بجٹ، کمیٹی اور فائل کا موضوع بن گیا۔

اداروں کا ڈھانچہ: منصوبہ، بجٹ اور پالیسی، ریاستی ترجمے کے تین ستون تھے:

ادارہ	ملک	بنیادی مینڈیٹ	ترجمے کی سمت
ساہتیہ اکیڈمی	ہندوستان	ہندوستانی زبانوں میں باہمی ترجمہ	اردو سے ہندی، بنگالی، تمل اور برعکس
مقتدرہ قومی زبان	پاکستان	اردو کو سرکاری و سائنسی زبان بنانا	انگریزی سے اردو، اصطلاح سازی
قومی کونسل برائے فروغِ اردو	پاکستان	اردو کی ترقی و اشاعت	کلاسیکی و جدید ادب کا اردو ترجمہ
نیشنل بک ٹرسٹ / فاؤنڈیشن	دونوں	سستی کتابیں چھاپنا	بچوں کا ادب، نصابی ترجمہ

طریقہ کار سب کا ایک تھا:

۱۔ کمیٹی: موضوع اور کتاب کا انتخاب بیورو کریٹ اور دو تین پروفیسر کرتے۔

۲۔ ٹینڈر: مترجم کا انتخاب اکثر "اقربا پروری" یا "سینئرٹی" پر ہوتا۔

۳۔ معاوضہ: فی صفحہ کے حساب سے۔ اس نے "جلدی اور زیادہ" کا کلچر پیدا کیا۔

۴۔ نظر ثانی: سرکاری ادارے کا ایڈیٹر "قابل اعتراض" مواد نکال دیتا۔

یوں مترجم ایک بار پھر "ملازم" بن گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب "صاحب" کی جگہ "ڈائریکٹر" بیٹھا تھا۔

متن کا انتخاب: وحدت، بیکہتی اور بے ضرر مواد۔ ریاستی اداروں نے تین اصولوں پر کتابیں چنی:

الف: قومی بیکہتی کا اصول۔ ہندوستان میں ساہتیہ اکیڈمی نے پریم چند، ٹیگور، قرۃ العین حیدر کا ایک دوسرے کی زبانوں میں ترجمہ

کرایا۔ مقصد: "کثرت میں وحدت" دکھانا۔ پاکستان میں مغربی پاکستانی ادب کا مشرقی پاکستان کی زبانوں میں اور برعکس۔ مقصد:

"لسانی ہم آہنگی" ۱۹۷۱ کے بعد یہ منصوبہ رک گیا۔

ب: بے ضرر کلاسیک کا اصول

ہومر، شیکسپیر، ٹالسٹائی، ڈکنز، کیونکہ یہ "محفوظ" تھے۔ ان پر کوئی فرقہ یا پارٹی ناراض نہیں ہوتی۔ "کامو" اور "سارتر" کم چھپے کیونکہ

وہ "وجودی مایوسی" پھیلاتے تھے۔ "منٹو" اور "عصمت" اردو سے انگریزی میں کم گئے کیونکہ وہ "فحش" سمجھے گئے۔

ج: سائنسی اور نصابی ضرورت کا اصول

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

مقتدرہ نے فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی کی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ اردو سائنس بورڈ نے "سائنس" جریدہ نکالا۔ مقصد: اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ "کشش ثقل" تو آگئی، مگر یونیورسٹی میں پڑھانے والا کوئی نہ تھا۔

"کیا نہیں چنا گیا؟" سیاسی فلسفہ، تنقیدی تاریخ، مذہبی مکالمہ کیونکہ ریاست کو "اختلاف" سے ڈر لگتا تھا۔ یوں ادارہ جاتی ترجمہ "غیر متنازعہ" ادب کا قبرستان بن گیا۔

"لسانی اثرات": "سرکاری اردو" کی پیدائش

ادارہ جاتی ترجمے نے اردو کو تین نئے رنگ دیے:

۱. "اصطلاح سازی": مقتدرہ نے لاکھوں اصطلاحات بنائیں۔ "کمپیوٹر" کے لیے "حساب کار"، "فائل" کے لیے "مسل"، "ٹیلی

ویژن" کے لیے "دور درشن"۔ مگر عوام نے قبول نہ کیا۔ "ٹی وی" ہی چلا۔ یہ "مصنوعی اردو" کہلائی۔

۲. "نثری یکسانیت": "سرکاری مترجم کو جلدی تھی اور ڈر بھی۔ اس نے "محفوظ نثر" لکھی۔ نہ فورٹ ولیم کی چاشنی، نہ سرسید کا جوش، نہ ترقی پسند کی کاٹ، نہ حلقے کی علامت۔ یہ "فائل کی نثر" تھی: درست، بے روح، بے خطر۔

۳. "ترجمہ برائے ترجمہ": "ہر سال" ہدف "پورا کرنا ہوتا تھا۔ سوکتا ہیں چھاپنی ہیں۔ معیار ثانوی ہو گیا، تعداد اول۔ نتیجہ: ہزاروں کتابیں گوداموں میں سڑ گئیں۔ قاری تک نہ پہنچیں۔

"مترجم کا نیاروپ: ملازم سے کلرک تک"

ریاستی ادارے میں مترجم کی حیثیت چار درجے گری:

۱. "گمنامی": کتاب پر لکھا ہوتا "مقتدرہ کی شائع کردہ"۔ مترجم کا نام اندر چھپا ہوتا، کبھی وہ بھی نہیں۔

۲. "معاوضہ": "فی صفحہ ۵۰ سے ۲۰۰ روپے۔ اس میں تحقیق ممکن نہیں۔ لہذا "گوگل ٹرانسلیٹ" سے پہلے ہی مشینی ترجمہ شروع ہو گیا۔

۳. "سنسر": "ایڈیٹر" سلیس "کرنے کے نام پر ہر تیز جملہ گول کر دیتا۔ مترجم احتجاج نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگلا ٹینڈر بھی چاہیے تھا۔

۴. "ترتیب کا فقدان": "فورٹ ولیم کے پنڈت، علی گڑھ کے علماء، ترقی پسندوں کے نظریاتی کارکن۔ ریاست نے کوئی "مترجم تربیت اکیڈمی" نہ بنائی۔ یوں معیار گرتا گیا۔

"تنقیدی جائزہ: قومی منصوبہ یا سرکاری کفن؟"

ادارہ جاتی ترجمے پر بھی دو آراء ہیں:

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

“الف: سرکاری موقف ”: یہ بیانیہ کہتا ہے کہ اداروں نے اردو کو ہزاروں کتابیں دیں۔ سائنس اردو میں آئی۔ ہندوستانی زبانوں میں مکالمہ ہوا۔ اگر ریاست نہ کرتی تو کون کرتا؟ پبلشر کو منافع چاہیے، وہ ٹالسٹائی نہیں چھاپتا۔

“ب: تنقیدی موقف ”: اردو کے اکثر ادیب لکھتے ہیں کہ ریاست نے ترجمے کو ”میٹنگ اور کارروائی“ بنا دیا۔ ترجمہ ”تخلیق“ سے نکل کر ”فائل“ بن گیا۔ قاری مرگیا، صرف ”ہدف“ زندہ رہا۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ نوجوان نسل نے سمجھ لیا کہ ترجمہ ”بور اور سرکاری“ چیز ہے۔

“مقالے کا موقف ”: ریاستی اداروں نے مقداری، معیار نہیں۔ انھوں نے اردو کو چھت دی مگر کھڑکیاں بند کر دیں۔ ترجمہ پھر ”طاقت“ کے تابع ہوا۔ فورٹ ولیم میں طاقت لندن تھی، علی گڑھ میں سرسید، ترقی پسندوں میں پارٹی، اب طاقت ”سیکرٹریٹ“ تھی۔ مترجم ہر دور میں ملازم ہی رہا، صرف آقا کا دفتر بدلتا رہا۔ اس تمام گفتگو سے درج ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں کہ:

۱. ”ایجنڈا“: ترجمہ ”قومی یکجہتی“ اور ”نصابی ضرورت“ کے تابع ہوا۔

۲. ”انتخاب“: محفوظ، غیر متنازعہ، کلاسیکی متن۔ خطرہ مول لینے سے گریز۔

۳. ”اسلوب“: ”سرکاری اردو“ پیدا ہوئی۔ درست، بے روح، اصطلاح زدہ۔

۴. ”مترجم“: وہ تخلیق کار سے گر کر کلرک بن گیا۔ نام، معاوضہ اور آزادی تینوں چھن گئے۔

۲۰۰۰ کے بعد انٹرنیٹ، نئی پبلشر اور این جی اوز نے ریاستی اجارہ داری توڑی۔ مگر سرکاری گوداموں میں پڑی ہزاروں کتابیں اب بھی سوال ہیں:

کیا ترجمہ چھاپنے کا نام ہے یا پڑھنے کا؟

مترجم کے مسائل۔ نظری و عملی (۱۸۵۰ تا ۲۰۲۶) ”جب ہر دور نے مترجم کو کٹھرے میں کھڑا کیا“

فورٹ ولیم کے پنڈت سے لے کر آج کے فری لانس مترجم تک، ایک بات مشترک ہے: اردو مترجم ہمیشہ ملزم رہا ہے۔ کبھی اس پر ”خیانت“ کا الزام، کبھی ”غلطی“ کا، کبھی ”غیر ضروری“ ہونے کا۔ یہ بحث اسی کٹھرے کا تجزیہ ہے۔ یہاں ہم دیکھیں گے کہ مترجم کے مسائل صرف لسانی نہیں، معاشی، نفسیاتی اور تہذیبی بھی ہیں۔ مسائل کو دو خانوں میں بانٹ سکتے ہیں: ”نظری مسائل“ یعنی وہ جو ترجمے کے تصور سے پیدا ہوئے۔ اور ”عملی مسائل“ یعنی وہ جو روزمرہ زندگی سے پیدا ہوئے۔

۱. ”نظری مسائل: چار بڑے مغالطے“

”الف: امانت بمقابلہ خیانت کا مغالطہ“

اردو میں سب سے پرانی گالی ہے: "مترجم خدا رِخوباں است"۔ (۱۶)

اس کا مطلب لیا گیا کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہی "امانت" ہے۔ مگر یہ لسانی طور پر ناممکن اور جمالیاتی طور پر خود کشی ہے۔ مثال: انگریزی جملہ

"It is raining cats and dogs" (۱۷)

کا لفظی ترجمہ "گتے اور بلیاں برس رہے ہیں" مزاحیہ ہو گا۔ "موسلا دھار بارش" امانت ہے یا خیانت؟

لارنس وینوٹی کہتا ہے کہ: "ہر ترجمہ "تشریح" ہے۔ امانت کا مطلب "اصل کی روح سے وفاداری" ہے، "لفظ سے غلامی" نہیں۔" (۱۸)

اردو میں یہ مغالطہ اس لیے پلا کیونکہ ہمارے ہاں "مذہبی متون" کے ترجمے کا دباؤ تھا۔ قرآن کے ترجمے میں لفظی وفاداری ضروری تھی۔ وہی اصول "گورکی" اور "کافکا" پر بھی لاگو کر دیا گیا۔ نتیجہ: ترجمہ یا تو انتہائی خشک ہو آیا "غلط" کہہ کر رد ہوا۔
"ب: اصل بمقابلہ نقل کا مغالطہ"

ترقی پسند اور جدید دونوں نے مترجم کو "دوسرے درجے کا ادیب" سمجھا۔ کیونکہ وہ "تخلیق" نہیں کر رہا، "نقل" کر رہا ہے۔ مگر بورخیس کہتا ہے کہ "اصل بھی ایک ترجمہ ہے۔ مصنف کائنات کو لفظوں میں ترجمہ کرتا ہے"۔ (۱۹)

اردو میں منٹو کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ "Toba Tek Singh" اصل سے کم طاقتور نہیں۔ بعض اوقات ترجمہ اصل کو نئی زندگی دیتا ہے۔ راشد کی "ایران میں اجنبی" ایلڈ سے متاثر ہے مگر خود ایک اصل ہے۔ یوں "اصل اور نقل" کی تقسیم ہی غلط ہے۔
ترجمہ "توسیع" ہے۔

"ج: عالمگیریت بمقابلہ مقامیت کا مغالطہ"

کیا مترجم کو متن کو "مقامی" بنانا چاہیے یا "اجنبی" رکھنا چاہیے؟ فورٹ ولیم نے مقامی بنایا۔ سر سید نے بھی۔ ترقی پسندوں نے روسی کسان کو "جولاہا" بنایا۔ مگر حلقے نے کہا: اجنبیت برقرار رکھو تاکہ قاری کو نئی دنیا ملے۔

وینوٹی اسے "Domestication vs Foreignization" کہتا ہے۔ اردو میں ہم نے ۱۵۰ سال Domestication کی۔
نتیجہ: قاری کو لگا کہ ساری دنیا اردو ہی بولتی ہے۔ اس نے ہمارے "ثقافتی تکبر" کو جنم دیا۔ آج جب نوجوان نیٹ فلکس پر سب ٹائٹل پڑھتا ہے تو اسے "اجنبی" پسند ہے۔ اس لیے مقامی بنانا اب حکمت نہیں رہی۔

"د: معروضیت کا مغالطہ"

یہ سمجھا گیا کہ مترجم کو "غیر جانبدار" ہونا چاہیے۔ اس کی اپنی رائے نہیں ہونی چاہیے۔ مگر تجا سونی نرنجنا کہتی ہے کہ:

"ہر ترجمہ سیاسی ہے۔ آپ جو چننے ہیں، جو چھوڑتے ہیں، جو لفظ استعمال کرتے ہیں، سب آپ کا نظریہ ہے۔" (۲۰)

فورٹ ولیم کالمترجم غیر جانبدار نہیں تھا۔ سرسید کا بھی نہیں۔ آپ غیر جانبدار ہو ہی نہیں سکتے۔ سوال صرف یہ ہے کہ آپ کا جھکاؤ کس طرف ہے۔

“عملی مسائل: زمین پر کھڑے مترجم کے دکھ”

“الف: معاشی قتل”

پاکستان میں سرکاری ادارے اگر آج بھی ۳۰۰ روپے فی صفحہ دیتے ہیں۔ ایک ۳۰۰ صفحے کی کتاب کا معاوضہ ۹۰ ہزار روپے۔ اس میں ۶ مہینے لگتے ہیں۔ یعنی ۱۵ ہزار ماہانہ۔ اس میں تحقیق، لغت، بجلی، نیٹ، سفر کا خرچ نکال دیں تو مترجم کے پاس کیا بچا؟ نتیجہ: یا تو وہ جلدی میں غلط ترجمہ کرے گا، یا یہ کام چھوڑ دے گا۔ ہندوستان میں ساہتیہ اکیڈمی کے نرخ بہتر ہیں مگر وہاں بھی "پسندیدہ" لوگوں کو کام ملتا ہے۔

“ب: تربیت کا فقدان”

دنیا میں "Translation Studies" ایک باقاعدہ شعبہ ہے۔ یونیورسٹی آف لندن، سوربون، جے این یو میں ڈگریاں ہیں۔ اردو میں کوئی ایک یونیورسٹی بھی "ایم اے ترجمہ" نہیں کرتی۔ مترجم یا تو انگریزی کا پروفیسر ہے یا اردو کا۔ اسے "بین اللسانیات" کی تربیت نہیں ملی۔ نتیجہ: وہ اصطلاحات میں پھنس جاتا ہے۔ "Postmodernism" کو کوئی "مابعد جدیدیت" کہتا ہے، کوئی "جدیدیت کے بعد"، کوئی "نوجدیدیت"۔ معیار نہیں۔

“ج: قانونی تحفظ کی عدم موجودگی”

کاپی رائٹ کا قانون مترجم کے حق میں نہیں۔ اگر آپ نے ۲ سال لگا کر ایک ناول ترجمہ کیا، پبلشر چھاپ کر غائب ہو جائے تو آپ کا معاوضہ بھی گیا اور نام بھی۔ "مترجم کا نام" سرورق پر لکھنا اب بھی عام نہیں۔ وہ "انتساب" میں چھپا ہوتا ہے۔ گویا ترجمہ کرنا شرم کی بات ہے۔

“د: مشینی ترجمے کا چیلنج”

گوگل ٹرانسلیٹ اور چیٹ جی پی ٹی نے ۲۰۲۰ کے بعد طوفان برپا کر دیا۔ پبلشر کہتا ہے: "مشین سے کروالو، ایڈیٹر سے درست کرا لیں گے۔ سستا پڑے گا۔" مگر مشین "جملے" ترجمہ کرتی ہے، "لہجہ" نہیں۔ وہ "کافکا کی بے چینی" یا "منٹو کی کاٹ" نہیں لاسکتی۔ مگر معاشی دباؤ میں ناشر کو لہجہ نہیں، قیمت چاہیے۔ یوں انسانی مترجم بے روزگار ہو رہا ہے۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

“ہ: سماجی قدر کا فقدان”۔ ہمارے ہاں ڈاکٹر، انجینئر، سی ایس ایس افسر کی عزت ہے۔ مترجم کی نہیں۔ والدین کہتے ہیں: ”بیٹا کچھ اور کر لو، اس میں کیا رکھا ہے۔“ مشاعرے میں شاعر کو تالی ملتی ہے، مترجم کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ نفسیاتی قتل ہے۔ اسی لیے اچھا دماغ اس پیشے میں نہیں آتا۔

“حل کی طرف: تجاویز”

۱. “ادارہ جاتی تربیت:” اردو یونیورسٹیوں میں ”شعبہ ترجمہ“ قائم ہو۔ کورس میں لسانیات، ثقافتی مطالعہ، تنقید اور پریکٹس شامل ہو۔

۲. “معاشی انصاف:” سرکاری نرخ کم از کم ۱۰۰۰ روپے فی صفحہ ہوں۔ رائلٹی کا نظام ہو۔ مترجم کا نام سرورق پر مصنف کے برابر آئے۔

۳. “تنقیدی کلچر:” اخبارات میں ”تبصرہ بر ترجمہ“ چھپے۔ اچھے ترجمے پر ایوارڈ ملے۔ برے ترجمے پر تنقید ہو۔ تاکہ معیار بنے۔

۴. “مشین سے مکالمہ:” مشینی ترجمے کو دشمن نہ سمجھیں، معاون سمجھیں۔ پہلا ڈرافٹ مشین سے، فنشنگ انسان سے۔ مترجم ”ایڈیٹر ثقافت“ بن جائے۔

“مترجم بطور ثقافتی مزدور”

۱. “نظری جیل:” امانت، اصل، معروضیت کے مغالطوں نے مترجم کو آزاد نہیں ہونے دیا۔

۲. “معاشی جیل:” کم معاوضہ، کوئی تربیت، کوئی عزت۔ وہ ”ثقافتی مزدور“ ہے جسے اجرت بھی پوری نہیں ملتی۔

۳. “مستقبل کا خطرہ:” مشین اسے کھا جائے گی اگر وہ ”لہجے اور تہذیب“ کا ماہر نہ بنا۔

۴. “امید:” اگر ہم مترجم کو ”شریک تخلیق کار“ مان لیں، اسے پڑھائیں، اسے معاوضہ دیں، اسے عزت دیں تو اردو ترجمہ ۲۱ ویں صدی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ ورنہ یہ صرف سرکاری گوداموں کی زینت بن جائے گا۔

اردو سے تراجم، دنیا میں اردو کی نمائندگی بطور ثقافتی سفارت کاری (۱۹۱۰ تا ۲۰۲۶) ”جب ہم نے خود کو دنیا کو پڑھانا چاہا“

۱۸۰۰ سے ۱۹۳۷ تک اردو ترجمے کی سمت ”درآمد“ تھی۔ ہم دنیا کو اردو میں لارہے تھے۔ ۱۹۳۷ کے بعد آہستہ آہستہ ”برآمد“ کا

سوال پیدا ہوا: دنیا کو اردو کیسے دکھائیں؟ یہ سوال تہذیبی شناخت، نوآبادیاتی احساس کمتری اور عالمی منڈی تینوں سے جڑا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ انگریز نے ہمیں پڑھا، مگر اپنے مقصد کے لیے۔ ٹیگور کو نوبل ملا تو بنگالی دنیا تک گیا۔ رومی کو انگریزی ملی تو تصوف امریکہ تک

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

گیا۔ مگر غالب، میر، منٹو، عصمت کون پڑھے گا؟ انہیں کون ترجمہ کرے گا؟ اور اگر کرے گا بھی تو کیا وہ "اردو کی روح" برقرار رکھ پائے گا؟

یہ گفتگو اسی "برآمد" کی کہانی ہے۔ یہ کہانی "سفارت کاری" کی بھی ہے اور "مزاہمت" کی بھی۔ ہم نے دنیا کو بتانا چاہا کہ ہم صرف "صوفی" یا "دہشت گرد" نہیں، ہمارے پاس کہانی، طنز، سوال اور خواب بھی ہیں۔

“چار ادوار: کس نے، کب، کیوں ترجمہ کیا”

دور	مدت	مرکزی محرک	بڑے نام	مسئلہ
اول: نوآبادیاتی انتخاب	۱۹۱۰-۱۹۴۷	مستشرقین کی علمی دلچسپی	ایف آر سی بگلی، رالف رسل	صرف "کلاسیک" چنا گیا، جدید ادب نظر انداز
دوم: ترقی پسند سفارت	۱۹۵۰-۱۹۷۰	سوشلسٹ بلاک سے مکالمہ	کارلو کوپولا، رالف رسل، خورشید الاسلام	صرف "ترقی پسند" ادب گیا، غزل / مرثیہ نہیں
سوم: یونیورسٹی منصوبہ	۱۹۷۰-۲۰۰۰	امریکی یورپی شعبہ جات اردو	فرانسس پریچٹ، محمد عمر مین، سی ایم نعیم	اکادمی تک محدود، عوامی قاری تک نہ پہنچا
چہارم: منڈی اور این جی اوز	۲۰۰۰-۲۰۲۶	عالمی اشاعتی منڈی + "مسلم دنیا" کا تجسس	دائشامہن جونی، میٹ رتج، پیٹنگوئن انڈیا	"مظلوم عورت" اور "فسادات" بیچنا آسان، غالب مشکل

“متن کا انتخاب: دنیائے ہمیں کیسے دیکھا، ہم نے خود کو کیسے دکھایا”

“الف: جسے دنیائے چنا”

مغربی پبلشر اور مترجم نے اردو سے تین چیزیں چنی:

۱. "فسادات اور تقسیم": منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو" سب سے زیادہ ترجمہ ہوئے۔ کیونکہ مغرب کے لیے برصغیر کا سب سے بڑا "ڈرامہ" تقسیم تھی۔ منٹو اس کا سب سے کڑوا روی تھا۔

۲. "عورت کی مظلومیت": عصمت چغتائی کا "لحاف"، خدیجہ مستور کا "آنگن"۔ "پردہ، پس ماندگی، بغاوت" مغربی فیمنزم کے لیے پرکشش موضوع تھا۔

۳. "صوفی و شاعرانہ رومان": غالب اور اقبال کے منتخب اشعار، رومی کی طرز پر۔ "مشرقی حکمت" کا لیبل لگا کر بیچا گیا۔

”ب: جسے ہم دکھانا چاہتے تھے مگر نہ دکھاسکے“

۱. ”غزل کی پیچیدگی“: میر کا ”پتا پتا بوٹا بوٹا“ انگریزی میں کیسے آئے؟ ردیف قافیہ ٹوٹے تو غزل مر جائے۔ اس لیے میر اور غالب کا بڑا حصہ اب تک غیر مترجم ہے۔

۲. ”داستان کی طوالت“: طلسم ہو شرابا، ۸ جلدیں، کون پڑھے گا؟ کون چھاپے گا؟ یوں ہماری سب سے بڑی صنف دنیا سے اوجھل رہی۔

۳. ”طنز و مزاح“: مشتاق یوسفی، بطرس بخاری۔ مزاح کا ترجمہ سب سے مشکل ہے۔ ”اردو محاورہ“ انگریزی میں لطفہ نہیں رہتا۔ نتیجہ: دنیا کے سامنے ”اردو“ کا جو چہرہ گیا وہ ”زنمی، سنجیدہ، مظلوم“ تھا۔ ”ہنستا، کھیلتا، عشق کرتا“ اردو کا چہرہ پیچھے رہ گیا۔

”لسانی و ثقافتی مسائل: سات گانٹھیں“

۱. ”تہذیبی گانٹھ“: ”آنچل، ڈیوڑھی، محرم، غیر محرم“ کا انگریزی میں کیا ہو؟ فٹ نوٹ لگاؤ تو کہانی کا بہاؤ ٹوٹے۔ نہ لگاؤ تو قاری سمجھ نہ۔

۲. ”لسانی گانٹھ“: ”اردو کی“ ”تکرار، مقفی انثر، اشعار کی بھرمار“ انگریزی قاری کو ”زیادہ“ لگتی ہے۔ ایڈیٹر کاٹ دیتا ہے۔ اصل کا حسن ختم۔

۳. ”نفسیاتی گانٹھ“: ”مغربی مترجم اکثر“ وضاحت“ کے چکر میں متن کو ”سادہ“ بنا دیتا ہے۔ منٹو کا ابہام، انتظار حسین کا اساطیری پن غائب ہو جاتا ہے۔

۴. ”سیاسی گانٹھ“: ”۹/۱۱ کے بعد“ ”مسلم ادب“ کی منڈی بنی۔ پبلشر چاہتا ہے کہ ہر اردو کہانی میں ”داڑھی، بم، عورت“ ہو۔ غالب اس فارمولے پر پورا نہیں اترتا، اس لیے نہیں بلکتا۔

۵. ”معاشی گانٹھ“: ”انگریزی میں ترجمہ چھپوانا مہنگا ہے۔ ایجنٹ، کاپی رائٹ، ایڈوانس۔ اردو پبلشر کے پاس بجٹ نہیں۔ مترجم مفت میں کرے تو معیار نہیں آتا۔

۶. ”نام کی گانٹھ“: ”سرورق پر لکھا ہوتا“ ”Stories by Manto, translated by X“ - خریدار منٹو کو جانتا ہے، X کو نہیں۔ یوں مترجم کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

۷. ”مرکز کی گانٹھ“: ”نیویارک اور لندن کے پبلشر فیصلہ کرتے ہیں کہ ”عالمی ادب“ کیا ہے۔ وہ اگر کہیں کہ اردو میں ”جادوئی حقیقت نگاری“ نہیں تو آپ کا ناول رد۔

”کامیاب مثالیں: جب اردو نے دنیا کو چوٹ نکایا“

۱. ”الف رسل + خورشید الاسلام“: ان دونوں نے غالب کے خطوط اور دیوان کا ایسا ترجمہ کیا کہ انگریزی قاری نے کہا کہ ”یہ تو ہمارے ٹی ایس ایلٹ سے بڑا شاعر ہے“۔ (۲۱)۔ راز: انہوں نے غالب کو ”وضاحت“ سے نہیں، ”تخلیقی انداز“ سے پیش کیا۔
۲. ”فرانسس پریچٹ“: اس نے ”آپ گم“ اور ”بستی“ کا ترجمہ کر کے انتظار حسین کو عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ اس نے ”داستانوی لہجہ“ برقرار رکھا، فٹ نوٹ سے جان چھڑائی۔
۳. ”محمد عمر میمن کے“: ”Annual of Urdu Studies“ ۱۹۸۱ سے ۲۰۱۴ تک اس جریدے نے درجنوں افسانے، نظمیں، تنقیدی مضامین انگریزی میں دیے۔ یہ ”غیر منافع بخش سفارت“ تھی۔ اس سے امریکی یونیورسٹیوں میں اردو کے کورس چلے۔
۴. ”دائیشا مہن جونی“: اس نے منٹو کی کلیات کو نئے سرے سے ترجمہ کیا۔ زبان تیکھی، بے باک، منٹو جیسی۔ بک گئی۔ ثابت ہوا کہ اگر معیار ہو تو اردو بکتی ہے۔

”تنقیدی جائزہ: سفارت کاری یا خود پرستی؟“

اردو سے تراجم پر دو سوال ہیں:

”الف: کیا ہم نے خود کو ”ایگزوٹک“ بنا کر بیچا؟“

جی ہاں۔ ”الحاف، آنگن، ٹوبہ ٹیک سنگھ“ سب ”مظلوم مشرق“ کی تصویر بیچتے ہیں۔ غالب کی فلسفیانہ کائنات، میر کی ذات کا کرب، یوسفی کا طنز کم گیا۔ ہم نے منڈی کو وہ دیا جو وہ چاہتی تھی۔

”ب: کیا ہم نے ”احساسِ کمتری“ میں ترجمہ کرایا؟“

جی ہاں۔ ہمارے ہاں لکھاری کی کامیابی کا پیمانہ یہ بن گیا کہ ”انگریزی میں چھپایا نہیں“۔ اردو قاری ثانوی ہو گیا۔ یہ نوآبادیاتی ذہن کی توسیع ہے۔

”مگر تیسری بات بھی ہے“: اگر منٹو انگریزی میں نہ جاتا تو دنیا کو پتا ہی نہ چلتا کہ تقسیم صرف سیاست نہیں تھی، انسانیت کا قتل تھی۔

ترجمہ ”ظلم کی گواہی“ بھی ہے۔

”مستقبل کی راہ: سفارشات“

۱. ”ادارہ برائے عالمی ترسیل اردو“: حکومت پاکستان و ہندوستان مل کر ایک ادارہ بنائیں جو مترجم کو تربیت، معاوضہ اور کاپی رائٹ

دے۔ ساتھ ہی اکیڈمی اور مقتدرہ کا مشترکہ پلیٹ فارم۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

۲. "مترجم مصنف ٹیم": منٹو کو مترجم اکیلا نہ کرے۔ اردو مصنف اور انگریزی مصنف مل کر کام کریں۔ جیسے رومی کو کولمین بارکس نے شاعر کے ساتھ مل کر کیا۔

۳. "منڈی سے مکالمہ، غلامی نہیں": "فسادات" کے ساتھ "غزل" بھی لے کر جاؤ۔ پبلشر کو بتاؤ کہ قاری صرف خون نہیں، حسن بھی چاہتا ہے۔

۴. "ڈیجیٹل سفارت": ریختہ، پرتھی پورٹل، یوٹیوب پر دولسانی قراءت۔ آڈیو بک، پوڈکاسٹ۔ کتاب سے آگے نکلنا ہو گا۔
"ہم دنیا کو کیا بتانا چاہتے ہیں؟"

۱. "ماضی": ہم نے دنیا کو اپنا زخم دکھایا، اپنا خواب کم۔

۲. "حال": انگریزی منڈی ہمارا موضوع چنتی ہے، ہم نہیں۔

۳. "مسئلہ": "غزل، داستان، مزاح اب تک سرحد پار نہ ہو سکے۔

۴. "حل": "پیشہ ور مترجم، ریاستی سرپرستی، اور خود اعتمادی۔ ترجمہ بھیک نہیں، مکالمہ ہے۔

اردو اگر دنیا کی بڑی زبان بننا چاہتی ہے تو اسے "لے جانا" پڑے گا۔ ورنہ وہ "گھر کی زبان" بن کر رہ جائے گی۔ اور گھر بھی اب ٹی وی اور موبائل کے ہیں، جہاں انگریزی راج کرتی ہے۔

مابعد نو آبادیاتی تناظر، کیا ہم آزاد ہیں؟ ترجمہ، مزاحمت اور AI کا چیلنج (۲۰۰۰ تا ۲۰۲۶) "۲۲۶ سال بعد آئینے کے سامنے"

۱۸۰۰ میں فورٹ ولیم سے ۲۰۲۶ تک اردو ترجمے نے پانچ ادوار دیکھے: استعماری، اصلاحی، انقلابی، جمالیاتی، ادارہ جاتی۔ ہر دور نے

دعویٰ کیا کہ وہ پچھلے سے آزاد ہے۔ فورٹ ولیم کے پنڈت نے کہا "ہم زبان بچا رہے ہیں"۔ سر سید نے کہا "ہم قوم بچا رہے ہیں"۔

ترقی پسندوں نے کہا "ہم طبقہ بچا رہے ہیں"۔ حلقے نے کہا "ہم فن بچا رہے ہیں"۔ ریاست نے کہا "ہم وحدت بچا رہے ہیں"۔

مگر سوال یہ ہے: کیا مترجم کبھی "بچانے" کے بجائے "آزاد" ہوا؟ کیا اردو ترجمہ ۲۲۶ سال بعد بھی نو آبادیاتی سائے سے نکلا؟ یہ باب

اسی سوال کا محاسبہ ہے۔ اور ساتھ ہی ۲۱ ویں صدی کا نیا سوال: جب مشین ترجمہ کرے گی تو انسان کا کیا ہو گا؟

"مابعد نو آبادیاتی سانچہ: تین کسوٹیاں"

تیجا سونی نرنجنا اور گائتری سیوک کے مطابق نو آبادیاتی ترجمہ تین کام کرتا ہے:

کیا اردو اس سے نکلی؟	نوآبادیاتی ترجمہ	کسوٹی
جزوی۔ ہم نے خود کو "مظلوم، فساد زدہ" دکھایا	محکوم کو "پسماندہ، غیر عقلی" دکھانا	تصویر کشی
نہیں۔ انگریزی آج بھی "اصل علم" کی زبان ہے	آقا کی زبان کو "اصل"، مقامی کو "نقل" بنانا	معیاریت
جزوی۔ اب بھی پبلشر، ڈونر، ریاست فیصلہ کرتی ہے	فیصلہ آقا کرتا ہے کہ کیا ترجمہ ہو	ابجینسی

“کڑوا سچ” سیاسی غلامی ۱۹۴۷ میں ختم ہوئی، تہذیبی غلامی نہیں۔ آج بھی ہمارا طالب علم سمجھتا ہے کہ "جدید علم" انگریزی میں ہے۔ اردو صرف "ترجمہ" کرتی ہے، "پیدا" نہیں کرتی۔ یہ فورٹ ولیم کی سب سے بڑی کامیابی تھی، اور ہماری سب سے بڑی ناکامی۔

“پانچوں ادوار کا مابعد نوآبادیاتی تجزیہ”

“الف: فورٹ ولیم” خالص نوآبادیاتی۔ ترجمہ "حکمرانی کا آلہ" تھا۔ مترجم ملازم تھا۔ ہم نے اسے رد کیا مگر اس کا سانچہ رکھ لیا: اوپر سے فیصلہ، نیچے سے تعمیل۔

“ب: علی گڑھ”۔ "خود اختیاری نوآبادیات"۔ سر سید نے انگریز کی برتری مان کر اس سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہ "دفاعی جدیدیت" تھی۔ ہم نے مغرب کو "آقا" سے "استاد" بنا دیا۔ مگر استاد بھی آقا ہی ہوتا ہے۔

“ج: ترقی پسند”۔ "سرخ نوآبادیات"۔ لندن کی جگہ ماسکو۔ سرمایہ داری کی جگہ سوشلزم۔ مگر مرکز بہر حال باہر تھا۔ ہم نے "مقامی" کو "عالمی نظریے" کے تابع کیا۔

“د: حلقہ ارباب ذوق”۔ پہلی بار "بغاوت"۔ مغرب سے ہیبت لی مگر مقصد کے لیے نہیں، فن کے لیے۔ یہ "تخلیقی مزاحمت" تھی۔ مگر یہ اشرافیہ تک محدود رہی۔ عوام تک نہ پہنچی۔

“ه: ریاست”۔ "نوکر شاہی نوآبادیات"۔ انگریز چلا گیا، فائل رہ گئی۔ مترجم اب "کلرک" ہے۔ اس کا آقا "سیکرٹری" ہے۔ غلامی کا رنگ بدلا، ذائقہ نہیں۔

“نتیجہ”۔ ہم ۲۲۶ سال میں "آقا" بدلتے رہے، "غلامی" نہیں۔ ترجمہ ہمیشہ طاقت کے مرکز کے تابع رہا۔ مرکز کبھی کلکتہ، کبھی علی گڑھ، کبھی ماسکو، کبھی اسلام آباد، کبھی نیویارک۔ مترجم کبھی مرکز نہ بن سکا۔

“مزاحمت کی شکلیں: کیا ہم نے کبھی انکار کیا؟”

جی ہاں، تین جگہ ہم نے مزاحمت کی:

۱. "میراجی کا انکار": اس نے "منشور" کو رد کیا۔ کہا فن پہلے ہے۔ یہ "جمالیاتی مزاحمت" تھی۔
 ۲. "عسکری کا انکار": اس نے مغرب کی نقالی اور مخالفت دونوں کو رد کیا۔ کہا "اپنی روایت سے مکالمہ کرو"۔ یہ "تہذیبی مزاحمت" تھی۔

۳. "انتظار حسین کا انکار": اس نے داستان کو واپس لا کر "جدیدیت" کو دیسی بنایا۔ یہ "ہیئتی مزاحمت" تھی۔
 مگر یہ سب انفرادی تھیں۔ اجتماعی مزاحمت نہ بن سکیں۔ کیونکہ ہمارے پاس "مترجم کی انجمن" نہیں، "مترجم کا ادارہ" ہے۔ اور ادارہ ہمیشہ ریاست کا ہوتا ہے۔

“۲۱ ویں صدی کا نیا آقا: مشینی ترجمہ اور AI”

۲۰۰۰ کے بعد ایک نیا نوآباد کار آیا ہے۔ الگورتھم، گوگل ٹرانسلیٹ، چیٹ جی پی ٹی، میٹا۔ یہ فورٹ ولیم سے زیادہ خطرناک ہے۔ کیوں؟

AI کا آقا	فورٹ ولیم کا آقا
کوڈ ہے، نا دیدہ ہے	انسان تھا، سمجھا جاسکتا تھا
مقصد مبہم ہے: ڈیٹا، منافع، کنٹرول	مقصد واضح تھا: حکومت
سیکنڈ میں ۱۰ لاکھ جملے	سال میں ۱۰ کتابیں

مترجم کو ملازم بنایا مترجم کو بے روزگار کرے گا۔

AI کے چار چیلنج

۱. "معیار کا بحران": "مشین" سلیس "لکھتی ہے"، "صادق" نہیں۔ وہ منٹو کی کاٹ اور غالب کی تہہ داری نہیں لاسکتی۔ مگر ناشر کو سستا چاہیے۔

۲. "تہذیبی چوری": AI: کو تربیت دینے کے لیے ہماری ساری کتابیں کھلائی جا رہی ہیں۔ کل کو وہ ہمیں ہی بیچے گا۔ یہ "ڈیجیٹل نوآبادیات" ہے۔

۳. "زبان کی موت": "اگر مشین ہر زبان کو انگریزی میں بدل دے تو مقامی زبانیں کیوں سیکھیں؟ اردو گھر کی بولی" بن کر مر جائے گی۔

۴. "مترجم کی شناخت": "جب مشین ترجمہ کرے گی تو" انسانی مترجم "صرف" ایڈیٹر "بن جائے گا۔ اس کی تخلیقی حیثیت ختم۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

”مزاحمت کی نئی صورت: ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

مابعد نوآبادیاتی تناظر ہمیں سکھاتا ہے کہ غلامی کا جواب "انکار" نہیں، "حکمت عملی" ہے۔ AI کے دور میں چار حکمت عملیاں:

۱. "مشین کو اوزار بناؤ، آقا نہیں" پہلا ڈرافٹ مشین سے، فنشنگ انسان سے۔ مترجم "ثقافتی ایڈیٹر" بنے۔ وہ لہجہ، طنز، تہذیب ڈالے جو مشین نہیں ڈال سکتی۔

۲. "مقامی ڈیٹا پر قبضہ" اپنی کلاسیک، اپنی بولیاں، اپنے محاورے خود ڈیجیٹائز کرو۔ تاکہ AI ہمیں ہماری ہی زبان میں لوٹائے، غلط نہ کرے۔

۳. "ترجمے کی تنقید" ہر مشینی ترجمے پر تنقیدی تبصرہ۔ "مشین نے غالب کو کیا سے کیا بنا دیا"۔ اس سے عوامی شعور بنے گا۔

۴. "مترجم کی تربیت"۔ نئے مترجم کو "دولسانی" نہیں، "دو تہذیبی" بناؤ۔ اسے AI چلانا بھی آئے اور میر کی زمین بھی۔ وہ "سائبرگ مترجم" ہو۔

"نظر انداز شدہ صنفیں"

۱۔ بچوں کا ادب اور مزاح، بچوں کا ترجمہ: تربیت یا تفریح؟

اردو میں بچوں کے لیے اصل مواد کم تھا۔ اس لیے ترجمہ ہی سہارا تھا۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے روسی کہانیاں، "ٹام اینڈ جیری" کے بغیر لفظوں والے کالمس، "عالمی کلاسیک" چھاپے۔ "مسئلہ" مترجم نے "فرہنگ" نہ بدلی۔ برف، چینی، کرسمس ٹری، اردو بچے کے لیے اجنبی تھے۔

نتیجہ: بچہ کہانی سے جڑ نہ سکا۔ ابن انشانے "اردو کی آخری کتاب" میں پیروڈی کی: "انگریزی کہانی کا ہیرو سردی میں کوٹ پہنتا ہے، ہمارا ہیرو لو چلنے پر بھی نہیں۔"

"کامیاب مثال" سریندر پرکاش نے "روسی لوک کہانیاں" کو "پنجاب کے گاؤں" میں ڈھال دیا۔ کرداروں کے نام بدل دیے۔ یہ "تخلیقی خیانت" تھی مگر بچہ جڑ گیا۔

۲۔ "مزاح کا ترجمہ: ناممکن کو ممکن بنانا"

پطرس بخاری، شفیق الرحمن، مشتاق یوسفی کا انگریزی میں ترجمہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیوں؟ مزاح کا انحصار "لفظی کھیل، تہذیبی

حوالہ، لہجہ" پر ہے۔ مثال: یوسفی لکھتے ہیں "دلی کے وہ لال قلعے"۔ اس میں "لال" رنگ بھی ہے، "لال قلعہ" عمارت بھی، اور

"لال" یعنی محبوب بھی۔ انگریزی میں تین لفظ چاہئیں۔ لطیفہ مر گیا۔ "حل کیا ہے؟" مترجم کو "تہقہہ" ترجمہ کرنا چاہیے، "جملہ"

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

نہیں۔ اگر لفظی ترجمہ ہنسانہ سکے تو نیا لطیفہ گھڑ دو جو اسی اثر کو پیدا کرے۔ یہ "خیانت" نہیں "وفاداری" ہے۔ مگر ہمارے ناقدین ماننے کو تیار نہیں۔

”خواتین مترجم۔ گمشدہ آوازیں“

۱. تاریخ کی خاموشی: ”فورٹ ولیم سے مقتدرہ تک، مترجم مرد تھا۔ عورت اگر ترجمہ کرتی بھی تو نام شوہر یا بھائی کا لگتا۔“
۲. تین بڑی مثالیں:

”الف: عصمت چغتائی: ”اس نے روسی افسانے ترجمہ کیے۔ مگر دیباچے میں لکھا ”وقت گزاری کے لیے“۔ (۲۲)“
تاکہ ”عالمہ فاضلہ“ کا ٹھپہ نہ لگے۔

”ب: قرۃ العین حیدر: ”نے انگریزی ناول ”آگ کا دریا“ خود انگریزی میں ”River of Fire“ کیا۔ یہ ”خود ترجمہ“ کی نادر مثال ہے۔ اس نے مواد بھی بدلا۔ اردو قاری اور انگریزی قاری الگ ہیں، یہ مان لیا۔

”ج: فہمیدہ ریاض: ”اس نے مولانا روم کے منتخب اشعار کا ترجمہ کیا۔ مگر ”عورت کی نظر“ سے۔ جہاں مرد مترجم ”عشق حقیقی“ پر زور دیتا، فہمیدہ نے ”عورت کی محرومی“ نکالی۔ ”مسئلہ“: ”خواتین مترجم کو ہمیشہ ”زنانہ ادب“ دیا گیا۔ بچوں کی کہانیاں، گھریلو ناول۔ ”سنجیدہ فلسفہ“ مرد کے پاس رہا۔ یہ تقسیم اب ٹوٹ رہی ہے مگر آہستہ۔

”مستقبل“: ”ڈیجیٹل دور میں لڑکیاں سب ٹائٹل، بلاگ، فین فکشن ترجمہ کر رہی ہیں۔ وہ کسی ادارے کی محتاج نہیں۔ یہ ”خاموش انقلاب“ ہے۔

”ڈی اسپورا اور ڈیجیٹل عہد۔ ترجمے کے نئے راستے (۲۰۲۶ تا ۲۰۰۰)“

۱. ”ڈی اسپورا: جب اردو گھر سے نکلی“

کینیڈا، امریکہ، برطانیہ میں دوسری نسل اردو پڑھ نہیں سکتی، مگر سن سکتی ہے۔ اس لیے ”آڈیو ترجمہ“ پیدا ہوا۔ منٹو کی کہانی یوٹیوب پر انگریزی میں، پیچھے اردو ٹیکسٹ۔ یہ ”ہائبرڈ ترجمہ“ ہے۔

۲. ”فین ٹرانسلیشن“: ”کورین ڈرامے، جاپانی انیمے، ترک سیریل۔ نوجوان خود اردو سب ٹائٹل بناتے ہیں۔ کوئی معاوضہ نہیں، کوئی ایڈیٹر نہیں۔ معیار کچا ہے مگر رفتار تیز ہے۔ یہ ”عوامی ترجمہ“ ہے۔ اس نے ریاست کی اجارہ داری توڑ دی۔

۳. ”مشینی ترجمہ + انسانی پالش“: ”آج کا فارمولہ یہ ہے: چیٹ جی پی ٹی سے پہلا ڈرافٹ لو، پھر خود لہجہ ڈالو۔ وقت %۷۰ بچتا ہے۔

خطرہ: نئی نسل ”لہجہ“ ڈھالنا سیکھے بغیر ہی مترجم بن جائے گی۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

۴۔ ریختہ اور ڈیجیٹل آرکائیو: ریختہ نے غزل کا لفظی ترجمہ نہیں، "تشریح" دی۔ ساتھ آڈیو لگادی۔ یہ "کثیر میڈیا ترجمہ" ہے۔ آئندہ ترجمہ صرف کتاب نہیں ہوگا، تجربہ ہوگا۔

۵۔ نیا آقا، نیا خطرہ: "گوگل اور اوپن اے آئی کے پاس اردو کا ڈیٹا ہے۔ وہ کل کو "مستند اردو" کی تعریف کریں گے۔ اگر ہم نے اپنا ڈیٹا خود نہ سنبھالا تو ۵۰ سال بعد "صحیح اردو" کیلئے فوراً سے آئے گی۔ یہ "ڈیٹا نوآبادیات" ہے۔

“حرفِ آخر: کیا ہم آزاد ہیں؟”

نہیں۔ ہم ۱۸۰۰ میں فورٹ ولیم کے پنڈت سے زیادہ آزاد نہیں۔ وہ صاحب کے حکم کا پابند تھا، ہم منڈی، ریاست اور اب مشین کے حکم کے پابند ہیں۔ مگر فرق یہ ہے: پنڈت کو پتا نہیں تھا کہ وہ غلام ہے۔ ہمیں پتا ہے۔ یہ شعور ہی آزادی کی پہلی شرط ہے۔ ترجمے کا مستقبل اس سوال میں ہے کہ کیا اردو مترجم "آلہ" رہے گا یا "مصنف" بنے گا؟ اگر وہ آلہ رہا تو مشین اسے کھا جائے گی۔ اگر وہ مصنف بنا، اگر اس نے کہا کہ "میں گور کی کو اردو میں نہیں لکھ رہا، میں اردو میں گور کی پیدا کر رہا ہوں"، تو وہ زندہ رہے گا۔ آزادی کسی ادارے سے نہیں ملے گی۔ یہ مترجم کو خود چھیننی پڑے گی۔ قلم سے، دلیل سے، اور اب کوڈ سے۔ اردو ترجمے کی ۲۲۶ سالہ کہانی طاقت، مزاحمت اور شناخت کی کہانی ہے۔ ہم نے فورٹ ولیم میں "غلامی" سے شروع کیا، AI کے دور میں "ڈیٹا غلامی" پر کھڑے ہیں۔ بیچ میں ہم نے اصلاح، انقلاب، فن اور فائل سب دیکھ لیے۔

مستقبل کا راستہ ایک جملے میں ہے: "مترجم کو "ملازم" سے "مصنف" بننا ہوگا، اور اردو سماج کو "قاری" سے "ناقد" بننا ہوگا۔" جب تک ہم ترجمے کو "دوسرے درجے کا کام" سمجھیں گے، مشین ہم سے وہ بھی چھین لے گی۔ جس دن ہم نے مترجم کو غالب کے برابر بٹھایا، اس دن اردو واقعی عالمی زبان بن جائے گی۔ ترجمہ پل نہیں، میدانِ جنگ ہے۔ اور یہ جنگ ابھی جاری ہے۔

حوالہ جات:

1. Niranjana, T. (1992). Siting translation: History, post-structuralism, and the colonial context_. Berkeley: University of California Press.pp-15
2. Even-Zohar, I. (1990). Poly system studies. Tel Aviv: Porter Institute.pp-23
3. Bourdieu, P. (1993). The field of cultural production. New York: Columbia University Press.pp-35
- ۴۔ لارڈ ویلیزلی،۔ Minute on the Foundation of Fort William College۔ کلکتہ، ۱۸۰۰۔
بحوالہ: جمیل جالبی،۔ تاریخ ادبِ اردو۔ جلد دوم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵، ص ۲۱۴۔
- ۵۔ ایضاً۔ ص ۲۱۵۔
- ۶۔ میرامن دہلوی۔ باغ و بہار۔ دیباچہ۔ کلکتہ: فورٹ ولیم کالج، ۱۸۰۳۔ جدید ایڈیشن: لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۲، ص ۷۔
7. Niranjana, T. (1992). Siting translation: History, post-structuralism, and the colonial context_. Berkeley: University of California Press.pp-18
- ۸۔ سرسید احمد خان۔ اسلوبِ خطابت، مضامین سرسید، جلد اول۔ علی گڑھ: انسٹی ٹیوٹ گزٹ پریس، ۱۸۷۰۔ مرتب: مولوی وحید الدین سلیم، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۰، ص ۵۵۔
- ۹۔ محمد حسن عسکری، (۱۹۷۹)۔ جدیدیت، یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ۔ لاہور: مکتبہ خیال۔ ص ۸۸
10. Said, E. W. (1979). Orientalism. New York: Vintage Books.pp-127
- ۱۱۔ سجاد ظہیر،۔ منشور: انجمن ترقی پسند مصنفین۔ لندن، ۱۹۳۶۔ مطبوعہ در: روشنائی۔ لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۵۹، ص ۱۱۔
- ۱۲۔ سجاد ظہیر،۔ "ادب اور زندگی"۔ نیا ادب، شماره ۳، ۱۹۴۰، ص ۱۸۔
- ۱۳۔ میکسم گورکی،۔ (۱۹۴۴)۔ ماں (علی عباس حسینی، مترجم)۔ لاہور: مکتبہ اردو، ص ۳۲۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

۱۴۔ محمد حسن عسکری، "ادب اور سیاست"۔ مکالمہ، شماره ۲، ۱۹۵۵۔ کتابی صورت: جدیدیت، یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ۔ لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۷۹ء، ص ۸۸۔

۱۵۔ میراجی۔ گفتگو۔ بحوالہ: شیماجید۔ میراجی: شخصیت اور فن۔ لاہور: سنگ میل، ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۳۔

۱۶۔ اطالوی کہات، اردو میں رائج۔ پہلی بار تنقیدی استعمال: محمد حسن عسکری، "ترجمے کا مسئلہ"۔ سات رنگ، ۱۹۶۳۔ کتابی صورت: تزکیہ۔ لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۷۶ء، ص ۲۰۱۔

۱۷۔ لارنس وینوٹی _The Translator's Invisibility_۔ لندن: راؤ ٹلیج، ۱۹۹۵ء، ص ۲۳۔ اردو تلخیص: احمد، ندیم۔ ترجمے کا نظریہ۔ اسلام آباد: مقتدرہ، ۲۰۰۵ء، ص ۴۴۔

۱۸۔ "ایضاً"۔ ص ۴۶

۱۹۔ خورنہ لوئیس، بورخیس۔ "Pierre Menard, Author of the Quixote"۔ ۱۹۳۹۔ اردو تلخیص: نعیم، سی ایم۔

Ambiguities of Heritage۔ کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۹ء، ص ۷۷۔

۲۰۔ تیجاسونی نرنجننا _Siting Translation_۔ برکلی: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۹۲ء، ص ۲۔ اردو ترجمہ: سلیم اختر۔ ترجمہ بطور سیاست۔ لاہور: فلشن ہاؤس، ۲۰۰۸ء، ص ۹۔

۲۱۔ تبصرہ بر غالب _Times Literary Supplement_، ۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء۔ بحوالہ: رسل، رالف۔

The Oxford India Ghalib، دیباچہ۔ دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۔

۲۲۔ عصمت چغتائی _گفتگو_، انٹرویو برائے ادب لطیف، ۱۹۶۰ء۔ بحوالہ: جعفری، علی احمد۔ عصمت چغتائی: فن اور شخصیت۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلسنگ ہاؤس، ۱۹۹۱ء، ص ۲۱۰۔

کتابیات:

بنیادی ماخذ۔ ترجمہ شدہ متون اور اصل کتابیں

۱۔ "گلکرسٹ، جان۔" _A Grammar of the Hindoostanee Language_۔ کلکتہ: فورٹ ولیم کالج، 1796۔

۲۔ "دہلوی، میرامن۔" _باغ و بہار_۔ مرتب: رالف رسل۔ لندن: جارج ایلیں، 1959۔ [اصل: 1803]

۳۔ "افسوس، شیر علی۔" _آرائش محفل_۔ کلکتہ: فورٹ ولیم کالج، 1808۔

۴. "ذکاء اللہ، مولوی۔" تریبونو متری۔ دہلی: سائٹفک سوسائٹی، 1868۔
۵. "نذیر احمد، ڈپٹی۔" مرآة العروس۔ دہلی: خود، 1869۔
۶. "گورکی، میکسم۔" ماں۔ ترجمہ: علی عباس حسینی۔ لاہور: مکتبہ اردو، 1944۔
۷. "شولوخوف، میخائل۔" اورڈان بہتارہا۔ ترجمہ: سبط حسن۔ کراچی: مکتبہ دانش، 1955۔
۸. "ایلیٹ، ٹی ایس۔" The Waste Land۔ ترجمہ و تشریح: ان م راشد۔ لاہور: حلقہ ارباب ذوق، 1950۔
۹. "کافکا، فرانز۔" کایا کلپ۔ ترجمہ: محمد حسن عسکری۔ کراچی: مکتبہ جدید، 1954۔
۱۰. "کامو، البرٹ۔" اجنبی۔ ترجمہ: قاضی عبدالغفار۔ لاہور: نیا ادارہ، 1962۔
۱۱. "منٹو، سعادت حسن۔" Mottled Dawn: Fifty Sketches and Stories۔ ترجمہ: خالد حسن۔ دہلی: پینگلوئن، 1997۔
۱۲. "حیدر، قرۃ العین۔" River of Fire۔ خود ترجمہ شدہ۔ نئی دہلی: کالج فار ویمن، 1998۔ [اردو اصل: آگ کا دریا، 1959]
۱۳. "غالب، مرزا اسد اللہ خان۔" Ghalib: Life, Letters and Ghazals۔ ترجمہ: رالف رسل و خورشید الاسلام۔ کیمبرج: ہارورڈ یونیورسٹی پریس، 1969۔
۱۴. "حسین، انتظار۔" Basti۔ ترجمہ: فرانسس پریچٹ۔ دہلی: انڈیا انک، 1995۔
۱۵. "جالبی، جمیل۔" تاریخ ادب اردو، جلد دوم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، 1975۔ [فورٹ ولیم پرباب]
۱۶. "سدید، انور، ڈاکٹر۔" اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، 1967۔
۱۷. "عسکری، محمد حسن۔" جدیدیت، یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ۔ لاہور: مکتبہ خیال، 1979۔
۱۸. "نرنجنا، تیجاسونی۔" Siting Translation: History, Post-Structuralism, and the Colonial Context۔ برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، 1992۔
۱۹. "وینوٹی، لارنس۔" The Translator's Invisibility: A History of Translation۔ لندن: راؤ ٹلیج، 1995۔
۲۰. "زوہر، ایون۔" Polysystem Studies۔ تل ابیب: پورٹرانسٹی ٹیوٹ، 1990۔

Volume 07, Issue 01

جلد 07، شماره 01

۲۱. "بوردیو، پیئر۔" _The Field of Cultural Production_ - نیویارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، 1993۔
۲۲. "سعید، ایڈورڈ۔" _Orientalism_ - نیویارک: سنٹیج بکس، 1979۔
۲۳. "اختر، سلیم۔" _اردو ادب کی مختصر تاریخ_ - اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1995۔
۲۴. "آغا، وزیر۔" _تنقید اور جدید اردو تنقید_ - سرگودھا: مکتبہ عالیہ، 1988۔
۲۵. "پریچٹ، فرانسس۔" _The Romance Tradition in Urdu: Adventures from the Dastan of Amir Hamzah_ - نیویارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، 1991۔
۲۶. "میمن، محمد عمر۔" _The Annual of Urdu Studies_ - شماره 1 تا 29 - میڈیسن: یونیورسٹی آف وسکونسن، 1981۔ 2014۔
۲۷. "نعیم، سی ایم۔" _Ambiguities of Heritage: Fictions and Polemics_ - کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1999۔
۲۸. "ظہیر، سجاد۔" _روشنائی_ - لاہور: مکتبہ اردو، 1959۔ [ترقی پسند منشور پر مضامین] "ادارہ جاتی رپورٹیں، مقالات اور ڈیجیٹل ماخذ"
۲۹. "ساہتیہ اکیڈمی۔" _Annual Report 1955-2020_ - نئی دہلی: ساہتیہ اکیڈمی۔
۳۰. "مقتدرہ قومی زبان۔" _پچاس سالہ کارکردگی رپورٹ_ - اسلام آباد: مقتدرہ، 2008۔
۳۱. "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔" _فہرست مطبوعات 1979-2020_ - نئی دہلی: قومی کونسل۔
۳۲. "یونیسکو۔" _Index Translationum_ - آن لائن ڈیٹا بیس۔ آخری رسائی: 21 اپریل 2026۔
- <https://www.unesco.org>
۳۳. "ریختہ ڈاٹ او آر جی۔" _Rekhta E-books and Translations Archive_ - آخری رسائی: 21 اپریل 2026۔
۳۴. "حکومت پاکستان۔" _قومی تعلیمی پالیسی 2017_ - باب: "ذریعہ تعلیم اور ترجمہ" - اسلام آباد: وزارت تعلیم، 2017۔